جنوری تا جون ۲۰۱۴ء
جلد نمبر ۱
شمارہ نمبر ۴
المنار
مجلس طلباے قدیم تعلیم الاسلام کالج امریکہ کا علمی اور ادبی مجلّہ

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم نحمدہ و نُصلّی علیٰ رسولہ الکریم و علیٰ عبدہ المسیح الموعود

جلد نمبر ا ۔ شمارہ نمبر ۴
جنوری تا جون ۲۰۱۴ء

مجلس طلباے قدیم تعلیم الاسلام کالج امریکہ کا علمی اور ادبی مجلّہ

علم و عمل

اس شمارہ میں

مضامین

Front Cover: New Mosque at Talimul Islam College Rabwah -Courtesy Dr. Safeeullah Chaudhry)
Back Cover: A corridor of the Old T. I. College building -(Courtesy Dr. Safeeullah Chaudhry)

قرارداد تعزیت

ہم طلباے قدیم تعلیم الاسلام کالج اور دیگر حاضرین اپنے اس ہنگامی اجلاس کے ذریعے ڈاکٹر مہدی علی صاحب قمر کے بہیمانہ قتل کی پُرزور مذمت کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مہدی علی صاحب انسانیت کی خدمت کے مبارک جذبے کے تحت پاکستان میں عوام کی خدمت کی خاطر کچھ عرصے کے لیے امریکہ سے آ کر طاہر ہارٹ انسٹیٹیوٹ ربوہ میں کام کر رہے تھے۔ ابھی دو دن پہلے پہنچے تھے اور بزرگوں کی قبروں پر دعا کے لیے اپنی اہلیہ اور کم سن بچے کے ساتھ بہشتی مقبرہ جا رہے تھے کہ سماج دُشمن قاتلوں کی گولیوں کو نشانہ بن گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

ڈاکٹر مہدی علی صاحب کی شہادت کی خبر پاکستان اور بیرون پاکستان نہایت افسوس کے ساتھ سُنی گئی اور میڈیا نے اسے نمایاں طور پر شائع کیا کیونکہ یہ مذہب کے نام پر خون کی بدترین اور تازہ ترین مثال ہے۔

ہم جملہ حاضرین مجلس شہید کے خاندان خصوصاً بھائیوں چوہدری ارشد علی اور ہادی علی چوہدری، نائب پرنسپل جامعہ احمدیہ کینیڈا، شہید کی اہلیہ محترمہ اور بیٹوں سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور حق تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی بے مثال قربانی کو قبول فرمائے اور شہید کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور تمام پسماندگان کا خود حامی و ناصر ہو۔ آمین۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ہم ہیں تمام ممبران امریکہ۔ ۲۶ مئی ۲۰۱۴

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۴﴾

O mankind, We have created you from a male and a female; and We have made you into tribes and sub-tribes that you may recognize one another. Verily, the most honourable among you, in the sight of Allah, is he who is the most righteous among you. Surely, Allah is All-knowing, All-Aware.

[49:14]

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ صَخْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى اَجْسَامِكُمْ وَلَا اِلٰى صُوَرِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ ۔

(مسلم کتاب البر والصلة باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں کو نہیں دیکھتا اور نہ تمہاری صورتوں کو (کہ خوبصورت ہیں یا بدصورت)
بلکہ وہ تمہارے دِلوں کو دیکھتا ہے (کہ ان میں کتنا اِخلاص اور حُسنِ نیت ہے)۔

ترقّی کے مدارج کے لیے آزمایش ضروری ہے

حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

روحانی فائدہ بھی انہی کو پہنچتا ہے جو آپ کوشش کرتے ہیں۔ دیکھو ہمارے نبی کریم ﷺ سب سے اعلیٰ اور افضل تھے مگر انہوں نے بھی دین کی خاطر کیسے کیسے مصائب اُٹھائے۔ دین بھی تو مرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ چاہتا تو ایسا نہ کرتا مگر اس نے دُنیا کے لیے بھی یہی قانون رکھا ہے کہ محنت سے سب کچھ ہوتا ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کا فضل بھی ہو اور محنت بھی تو انسان منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ دُنیا کے کاموں کے لیے انسان کیسے کیسے دُکھ اُٹھاتا اور تکلیفیں برداشت کرتا ہے اور تب جا کر کچھ حاصل ہوتا ہے تو کیا دین کے لیے کچھ بھی محنت اور سعی نہیں کرنی چاہیئے؟ اگر تھوڑا سا مقدمہ آ جاوے تو پھر انسان اس کے واسطے کہاں کہاں سے سفارشیں لاتا ہے اور کس قدر خرچ کرتا ہے اور کتنی کوشش کرتا ہے اور اگر باوجود اتنی کوشش کے وہ مقدمہ خارج ہو جاتا ہے تو پھر اپیل کراتا ہے بلکہ اگر وہ بھی خارج ہو جاتی ہے تو پھر کیسی کیسی مصیبتیں برداشت کر کے اپیل در اپیل کرتا اور کیا کیا کر گزرتا ہے تو کیا دین کو ہی ایسا سمجھنا چاہیئے کہ وہ محض پھونک مارنے اور کسی وِرد وظیفہ کے کرنے سے حاصل ہو جائے گا۔ اور یونہی آرام طلبی سے گذارنے پر اس میں کامیابی حاصل ہو جائے گی؟ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔ (العنکبوت:۳) کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ صرف زبانی قیل و قال پر ہی ان کو چھوڑ دیا جائے گا اور صرف اتنا کہنے سے ہی کہ ہم ایمان لے آئے دین دار سمجھے جائیں گے اور ان کا امتحان نہ ہو گا؟ بلکہ امتحان اور آزمایش کا ہونا بہت ضروری ہے۔ سب انبیاء کو اس پر اتفاق ہے کہ ترقیٔ مدارج کے لیے آزمایش ضروری ہے اور جب تک کوئی شخص آزمایش اور امتحان کی منازل طے نہیں کرتا دیندار نہیں بن سکتا۔

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ دُکھ کے بعد ہی ہمیشہ راحت ہوا کرتی ہے۔ یاد رکھو جو شخص خدا تعالیٰ کی راہ میں دُکھ اور مصیبت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں وہ کاٹا جاوے گا۔ ترقی ہمیشہ مصائب اور تکالیف کے بعد ہوتی ہے اور ایمانی حالت کا پتہ اسی وقت لگتا ہے جب تکالیف اور مصائب آویں۔

روحانی فوائد حاصل کرنے کے لیے پہلے اپنے آپ کو دُکھ اور تکالیف اُٹھانے کے لیے تیار کر لینا چاہیئے۔

عشق اول سرکش و خونی بود
تا گریزد ہر کہ بیرونی بود

بعض لوگ آتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں پھونک مارو کہ اولیاء اللہ بن جاویں اور ہمارا سینہ صاف ہو جاوے اور روحانی معراج پر پہنچ جاویں اور ہمارے قلب میں پاکیزگی پیدا ہو جاوے۔ ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ سب کچھ دُکھوں اور تکالیف کے بعد مل جاتا ہے اور ضرور مل جاتا ہے مومن کو اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا۔ جب انسان دُنیا کے لیے طرح طرح کی تکالیف برداشت کر لیتا ہے۔ ایک کسان ہی کو دیکھو کہ پہر رات کے قریب اُٹھتا ہے ہل جوتتا ہے اور کتنی تکالیف اُٹھاتا اور محنت کرتا ہے۔ نہ رات کو آرام اور نہ دن کو۔ بلکہ جب بہت سی مشکل کے بعد فصل پک بھی جاتا ہے اس وقت بھی اس کے حاصل کرنے کے لیے کیا کیا مصائب اُٹھاتا ہے اور اپنے عیال و اطفال سے علیحدگی اختیار کر کے اُسے کاٹتا اور اس کو حاصل کرنے کے لیے کیسے کیسے دُکھ اُٹھاتا ہے اور اس دُنیا کے لیے جو آج ہے اور کل فنا ہو جائے گی مارا مارا پھرتا ہے اور مصیبت پر مصیبت اور دُکھ پر دُکھ اُٹھاتا ہے تو کیا پھر دین ہی ایسی چیز ہے جو محض پھونک مارنے سے حاصل ہو جاتا ہے اور اس میں کسی امتحان آزمایش اور محنت کی ضرورت نہیں؟

(ملفوظات جلد پنجم، صفحہ ۲۹،۳۰)

اردو کے مایہ ناز شاعر

منشی امیرؔ احمد مینائی

عبد الہادی ناصر، سابق لیکچرار تعلیم الاسلام کالج ربوہ
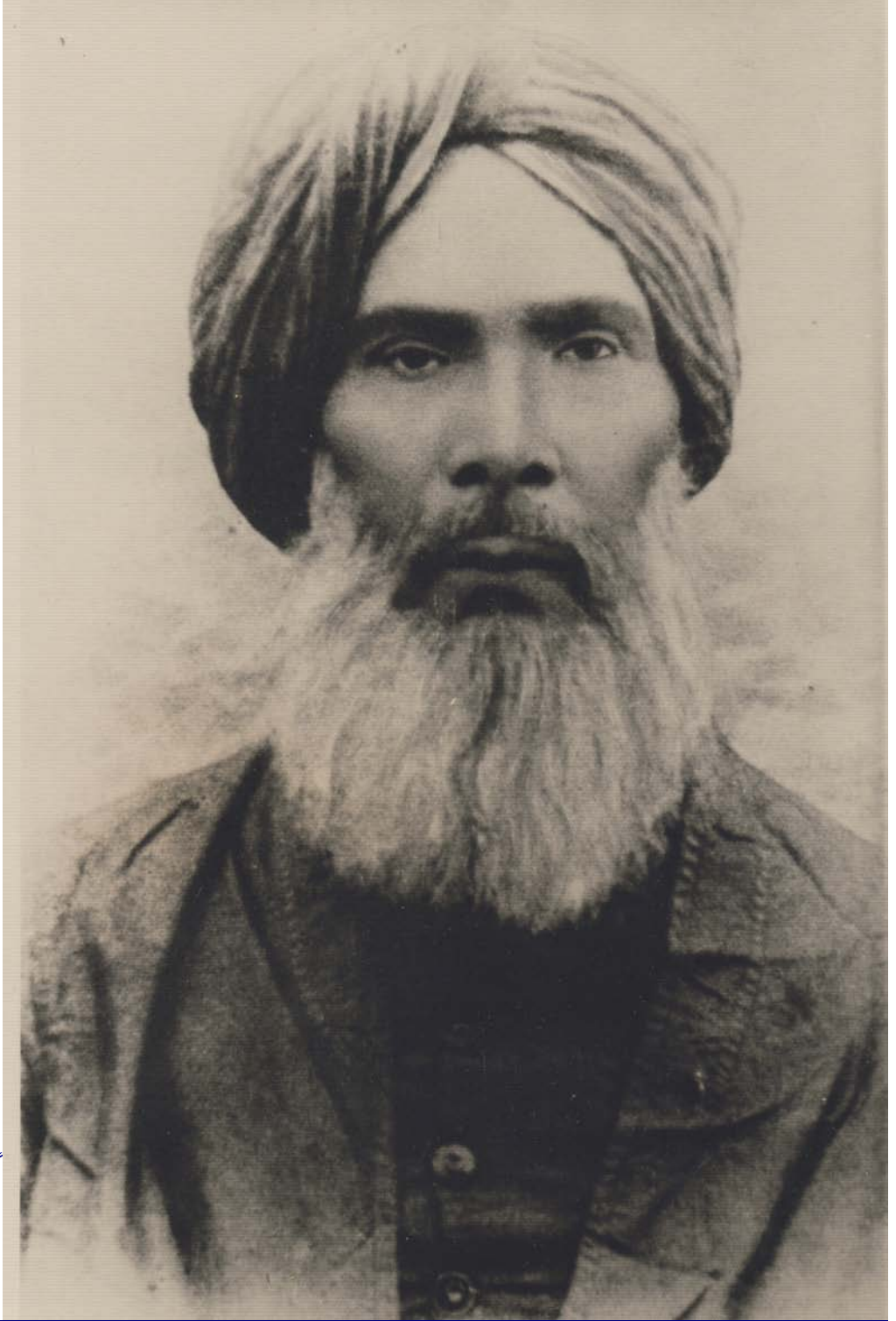
اردو کی دنیا میں دور آخر کے سب سے مشہور دو شاعر منشی امیرؔ مینائی اور داغ ہیں۔ جو اپنی پوری تابانی سے ادبی حلقوں کو منور کیا کرتے تھے۔ امیرؔ مینائی شاعری میں بلند حیثیت رکھتے ہیں۔ شعری اور ادبی حیثیت کے علاوہ اپنے وقت کے صاحب فضل اور کمال ہستیوں میں سے تھے۔ وہ اپنی خوبیوں اور قابلیت کی وجہ سے ایک نہایت بزرگ انسان تھے۔ آپ حضرت مخدوم شاہ مینائی لکھنوی کے برادر زادہ جانشین شیخ قطب الدین کی اولاد سے تھے۔ آپ 16 شعبان 1247ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ نو سال کے تھے کہ والد کا سایہ اٹھ گیا۔ پھر ان کے بڑے بھائی نے اپنی نگرانی میں تعلیم و تربیت کی۔ ابتدائی کتب اپنے والد سے پڑھی تھیں جن کا پیشہ تدریس تھا۔ پھر منشی

صاحب نے علماے فرنگی سے علم میں دسترس حاصل کی۔ نجوم و جفر سے بھی واقف تھے۔ ان دنوں لکھنو شعر و سخن کا گڑھ تھا۔ جہاں شعر و شاعری کا عام چرچا تھا۔ امیؔر مینائی نے کم عمری میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ منشی مظفر علی خان اسیر سے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ جو علم و فن میں یکتا تھے۔ ایک وقت آیا کہ وہ اپنے استاد سے بھی سبقت لے گئے۔

1857ء کے انقلاب کی وجہ سے امیؔر مینائی کو لکھنو چھوڑنا پڑا۔ اور رام پور آ گئے۔ پھر 1900ء میں آپ کو حیدر آباد دکن آنا پڑا۔ اور یہ سفر آپ کا سفر آخرت ثابت ہوا۔ آپ 1900ء میں انتقال کر گئے۔ امیؔر مینائی کی وفات کا حادثہ دنیاے شعر و ادب کے لیے بہت بڑا حادثہ تھا۔ منشی صاحب بہت سے اوصاف کے مالک تھے۔ آپ علم و عمل کے پیکر تھے۔ آپ کے کردار اور سیرت کی بلندی ہی آپ کی عظمت کی نشانی تھی۔ متقی اور پرہیز گار تھے۔ آپ کی طبیعت درد آشنا واقع ہوئی تھی۔ آپ کا یہ مشہور شعر جو بر زبان عام ہے اس بات کی غماضی کرتا ہے کہ

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیؔر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

امیؔر مینائی کو تصوف کا ذوق تھا اور عشق حقیقی کی طلب رکھتے تھے۔ آپ عالی ظرف اور وسیع القلب تھے۔ علوم و فنون میں آپ کی مہارت اپنے عروج پر تھی۔ اردو زبان کے غزال تھے۔ نظم کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ خیالات کی رنگینی اور مضامین کا تنوع ان کے اشعار میں جابجا ملتا ہے۔ پھر اپنے کلام کو حسن و عشق، تغزّل اور تشبیب تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ جس میں آپ نے حکمت، فلسفہ، تصوف و اخلاق کے خیالات کا ایک دریا بہا دیا۔ شاعری اور درویشی ساتھ ساتھ رہی۔ پھر شعر میں زبان کی سلاست، روانی اور لطافت جابجا پائی جاتی ہے۔ پھر نئی تراکیب، حسن بندش، استعارات، تلاش معنی، لطف گوئی اور ادب و انشاء کی خوبیوں سے آپ کے اشعار سیر اب نظر آتے ہیں۔ اہل فن تسلیم کرتے ہیں کہ امیؔر مینائی کے کلام میں ایسے اشعار ملیں گے جو قلب کو تڑپا دیتے ہیں اور روح کو گرما دیتے ہیں۔ لب پر آہ لاتے ہیں۔ اور دل میں اتر جاتے ہیں۔ ہر رنگ اور ہر مکتبہء فکر کے بہتر سے بہتر اشعار ان کے مجموعہ کلام میں ملتے ہے۔ اکثر اوقات ان کی غزل لفظ و بیان کے حوالے سے مرصع اور معنی و مفہوم کے لحاظ سے اثر میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ امیؔر مینائی کی غزلوں میں شباب کی ولولہ انگیزیوں میں مجازی حسن اور عشق کی مسرت خیزیوں کی کوئی انتہا نہیں۔ بعض دفعہ وہ شباب کی سرمستیوں کو بھی بڑے دردناک لہجے میں ادا کر جاتے ہیں۔ امیؔر مینائی کے مجموعہ کلام صنم خانہ ء عشق کو امتیازی درجہ حاصل ہے۔ جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے

عجب شے ہے صنم خانہ ء امیؔر

میں نے امیؔر مینائی پر اس لیے بھی لکھنا پسند کیا ہے کہ وہ ہماری جماعت کے عظیم شاعر، پاک و ہند کے مانے ہوئے چوٹی کے ادیب اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے جیّد صحابی حضرت حافظ مختار احمد شاہجہانپوری کے اُستاد تھے۔ خوش قسمتی سے مجھے اپنے طالب علمی کے زمانے میں اُن کی صُحبت میں اکثر بیٹھنے کا موقع ملتا رہا ہے۔ حضرت حافظ صاحب بڑے فخر سے اپنے اُستاد امیؔر مینائی کا ذکر کیا کرتے تھے اور اُن کے اکثر شعر زبانی یاد تھے۔ اُن کو بطور سند کے بیان فرمایا کرتے تھے۔

آیئے اب امیؔر مینائی کے گلستان ادب کی سیر کریں جس میں انہوں نے خوبصورت اور دلربا پھول کھلا رکھے ہیں اور ہر پھول کا رنگ اور خوشبو الگ الگ نظر آتے ہے۔ امیؔر مینائی کے مجموعہ کلام میں تصوّف، اخلاق اور حکمت جابجا نظر آتی ہے۔ چنانچہ ہم سب سے پہلے امیؔر کے فلسفہ خودی پر نظر ڈالتے ہیں امیؔر مینائی کہتے ہیں کہ جب تک خدا کی خاطر اپنی خودی اور انا خاک نہ کر دی جاے اسے خدا کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی چنانچہ آپ کہتے ہیں۔

خدا خدا کرے اور خودی کا دم بھی بھرے
بڑا فریبی ہے جھوٹا ہے وہ خدائی کا

امیؔر کتنی خوبصورتی سے خدا کے حضور اپنی ناتمامی کا اظہار کرتے ہیں۔

بشر سے حمد الٰہی امیؔر کیا ممکن
پہاڑ اٹھائے کہاں حوصلہ یہ رائی کا

خدا کے عفو اور رحمت پر امیؔر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔

کعبہ نشیں سنے تو کہیں اپنا درد دل
کعبے میں اینٹ چونے پتھر سے کیا کہیں

امیؔر ملتی ہیں بے مانگے نعمتیں کیا کیا
بڑا کریم ہے جس کا امیدوار ہوں میں

ایسا تری رحمت پہ بھروسہ ہے کہ مجھ سے
احسان اٹھایا نہیں جاتا ہے دعا کا

حشر میں بھیڑ گناہوں کی تو ہو گی پیچھے
اور گناہ گاروں کے آگے تیری رحمت ہو گی

عادت تو امیرؔ اچھی ہے فریاد و دعا کی
پر شیوہ تسلیم و رضا اور ہی کچھ ہے

امیرؔ اپنی روحانی پیاس کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

پیاس اس کی جو بجھے گی تو مے کوثر سے
ظرف عالی ہے امیرؔ احمد مینائی کا

خدا کے عفو کو کس خوبصورت طریقے سے بیان کرتے ہیں۔

موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا
بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا

کریم جان کے تجھ کو خطائیں کیں یارب
میرے گناہ سزاوار انتقام نہیں

امیرؔ مینائی اپنی نماز کو ہی رحمت کا حاصل نہیں سمجھتے بلکہ رحمت کو خدا کا فضل جانتے ہیں۔

رحمت ہی رحمت اس کی ہے کرے اگر قبول
میری نماز اسے ہے نہ میرا وضو پسند

حکم دے عفو کو یارب کہ کرے مطلع صاف
مرگ کے بعد بھی گھیرے ہیں خطائیں مجھ کو

امیرؔ زاہد کو اس کے زہد پر اترانے پر نصیحت کرتے ہیں۔

زاہد نگاہ کم سے کسی رند کو نہ دیکھ
کیا جانے اس کریم کو وہ ہے کہ تو پسند

عابد کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ وقت عبادت اگر آنسو نہ بہیں تو وہ عبادت کیسی:

زاہد کو گریہ، وقت عبادت ضرور ہے
اللہ کو نماز نہیں بے وضو پسند

جھکیے جو پیش یار تو آنسو بہایئے
ہے اس نماز کے لیے ایسا وضو پسند

کون پہنچائے مجھے کوچہ ءجاناں تک امیرؔ
لے چلیں کاش بہا کر میرے آنسو مجھ کو

امیرؔ خدا تعالیٰ کے وجود کی تلاش کے بارے میں معرفت کے نکات بیان کرتے ہیں۔

خدا کو دل میں ہی ڈھونڈو ادھر ادھر نہ پھرو
نہیں کتاب کا مطلب نہیں کتاب کے باہر

امیرؔ اس بے نشان کو دل میں پایا
جسے ڈھونڈا کیے تھے چار سو ہم

جس بے نشان کو ڈھونڈتے ہیں ہم جہاں میں
کہتا ہے دل کہ تجھ میں نہیں تو کہیں نہیں

امیرؔ خدا تعالیٰ کی بارگاہ کو ہی اپنا مقصود سمجھتے ہوئے کہتے ہیں۔

وہ شوخ لاکھ پردوں میں پردہ نشین نہیں
اور جو دیکھیے تو کہاں ہے کہیں نہیں

چوکھٹ سے تیری سر نہ ہٹے گا امیرؔ کا
سجدے سے گر کے اٹھے یہ ایسی جبیں نہیں

امیرؔ قناعت کے مضمون کو یوں بیان کرتے ہیں کہ

آرام سے ہوں فُقر کے بستر پہ میں گدا
تکیہ ہے جب سے رازق مطلق کی ذات پر

خدا جو دلوں کا حال جانتا ہے اس بارے میں امیرؔ اس کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

وہ خوب جانتا ہے جو ہے میری آرزو
منہ سے امیرؔ کچھ نہ میں وقت دعا کہوں

امیرؔ مینائی وصل یار (حقیقی عشق) کے بارے میں جب رخ یار کو نہیں پاتے تو اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے اپنے یار ازلی کے شہکار کو بوسے دے کر تسلی پاتے

ہیں۔

تسلی رخ یار میں جب کسی صورت نہیں ہوتی
تو بوسہ دے کے آنکھوں سے لگا لیتا ہوں قرآں کو

حضرت شیخ سے شعرا کی نوک جھوک ہوتی رہتی ہے۔ امیرؔ مینائی نے بھی حضرت شیخ کی حالت کا پورا تجزیہ کیا ہے۔

آتا ہے جو کچھ منہ میں وہ کہہ جاتا ہے واعظ
اور اس پہ یہ طرّہ ہے کہ قائل نہیں ہوتا

خواہش وصل تو کیونکر کہوں لیکن ناصح
دیکھ لینے کا تو حضرت کو بھی ارماں ہوگا

مسجد میں رند بھی ہیں ارباب زہد بھی ہیں
دیکھیں امیرؔ آئے کس پر بلائے واعظ

چھیڑ ہر بات میں اچھی نہیں اے ناصح
چٹکیاں لینے کو آیا ہے کہ سمجھانے کو

مسجد میں میں نے شیخ کو چھیڑا یہ کہہ کے آج
مے لاوں میکدے سے جو آب وضو نہ ہو

چشمِ واعظ پر ہے عینک دستِ واعظ میں عصا
ضعفِ پیری میں یہ دو باقی سہارے رہ گئے

شان اللہ کی اس بزم میں ناصح بھی ہیں چپ
بت بنے بیٹھے ہیں ہر بات کے رٹنے والے

گور میں آئے نکیرین تو میں نے سمجھا
ناصح آ پہنچے یہاں بھی میرا سر کھانے کو

یہ زباں چلتی ہے ناصح کہ چھری چلتی ہے
ذبح کرنے مجھے آیا ہے کہ سمجھانے کو

پھر دل کی کیفیت کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔

دل مجھ سے لیا ہے تو ذرا بولیے ہنسیے
چٹکی میں مسلنے کے لیے دل نہیں ہوتا

درد اور دل لازم ملزوم ہیں اس مضمون کو امیرؔ مینائی نے کئی جہتوں سے بیان کیا۔

جب درد محبت میں یہ لذت ہے تو یارب
ہر عضو میں ہر جوڑ میں کیوں دل نہیں ہوتا

دل کو آغاز محبت میں نہ سمجھو تھوڑا
بڑھتے بڑھتے یہی قطرہ کبھی دریا ہوگا

دیکھ اے درد جدا ہو نہ دل محزوں سے
اور الجھے گا یہ بیمار جو تنہا ہوگا

غنچہ گل کو تو سو بار شگفتہ دیکھا
غنچہ دل بھی الٰہی کبھی خنداں ہوگا

وہ مزہ دیا تڑپ نے، یہ آرزو ہے یارب
میرے دونوں پہلوؤں میں دل بیقرار ہوتا

میں نے چھاتی سے لگا کر جس کو رکھا عمر بھر
ہائے وہ نازوں کا پالا دل میرا جاتا رہا

کھو گیا دل کھو گیا رہتا تو کیا ہوتا امیرؔ
جانے دو اک بے وفا جاتا رہا، جاتا رہا

پوچھی امیرؔ سے کل میں نے دل کی حالت
سینے پہ ہاتھ رکھ کر بے اختیار رویا

اے دل خدا کے واسطے اب میری جان چھوڑ
تجھ کو نہ میں پسند، نہ مجھ کو ہے تو پسند

ادھر دل لوٹتا ہے اس طرف بجلی تڑپتی ہے
الٰہی خیر ہو بحث آ پڑی دو بیقراروں میں

دل جو کہتا ہے مجھے ضبط کی طاقت نہیں
ضبط کہتا ہے تڑپنے کی اجازت ہی نہیں

مزے جتنے تھے باغِ دہر میں سب چن لیے دل نے
نہ ایسا زخم ہے گل میں نہ ایسا داغ لالے میں

فی الحقیقت دل سے دل کو راہ ہوتی ہے امیرؔ
ہم ہیں ان کی یاد میں وہ ہے ہماری یاد میں

پہلو سے دل جدا ہو تو کچھ غم نہیں مجھے
اے دردِ دل جدا میرے پہلو سے تو نہ ہو

کیا پاس نہیں میرے جو تم غیر سے مانگو
پہلو میں میرے دل بھی ہے سینے میں جگر بھی

کثرت رنج سے رو رو کے نہ کر دل خالی
یہ بھرا گھر نہ اجاڑ اس کو بسا رہنے دے

پہلو میں میرے دل کو نہ اے درد کر تلاش
مدت ہوئی تباہی کا مارا سفر میں ہے

ہو درد عشق ایک جگہ تو دوا کروں
دل میں جگر میں سینے میں پہلو میں سر میں ہے

مردہ سا امیرؔ ایک سر راہ پڑا تھا
تیرا تو کہیں وہ دل رنجور نہیں ہے

دیکھ اے دل کبھی دھوکہ نہ حیا کا کھانا
شرم کی آڑ میں پوشیدہ شرارت ہو گی

عشق کے مضمون کو امیرؔ مینائی نے کئی طریقوں سے بیان کیا ہے۔

کیا برا عشق کا کوچہ ہے کہ اس میں سب کو
جان کو مال کو ایمان کو کھوتے دیکھا

وادیِ عشق وہ وادی ہے جہاں مر کے امیرؔ
برسوں بے گور و کفن لاش پڑی رہتی ہے

ہیں تغافل میں بھی سرگرم ستم وہ آنکھیں
آپ تو سوتے ہیں، فتنوں کو جگا رکھا ہے

مشرب عشق میں کیسی ہیں یہ الٹی باتیں
دل کے جانے کو یہ کیوں کہتے ہیں آنا دل کا

عشق کو صبر کہاں ضبط کہاں تاب کہاں
جان جانا نہیں ہمدم یہ ہے جانا دل کا

ایسے ہنگامے بہت دیکھے ہیں اس کوچے میں
حشر کیا فتنہ ہے جس سے میں پریشاں ہوتا

کیا بری شے ہے جوانی رات دن ہے تاک جھانک
ڈر بتوں کا اک طرف خوف خدا جاتا رہا

بولے یہ خضر پار اترنے کو جو کہا
دریائے محبت کا تو ساحل نہیں ہوتا

کہتے ہیں دل دے کے تڑپتے ہیں جو عاشق
ہوتا ہے کہاں درد اگر دل نہیں ہوتا

امیرؔ مینائی اپنے ضعف پیری اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

جو تیرے احساں ہیں ضعف پیری میں شکر اس کا کروں کیا
دعائیں دیتی ہے ہڈی ہڈی میرے بدن کی چٹک چٹک کر

محبوب کی بے رخی کے عالم کو یوں بیان کرتے ہیں۔

مرگ عاشق کی خبر آئی تو جھنجلا کے کہا
روز سو مرتے ہیں کب تک کوئی ماتم میں رہے

ہنس ہی دیں میرے پھولوں میں نہ روئیں نہ سہی
تازگی کچھ تو میری مجلس ماتم میں رہے

مر گئے عشق میں ہم تم سے یہ امید نہ تھی
چار آنسو بھی نہ ماتم میں ہمارے نکلے

شمع کے جلنے کو رونے سے تشبیہ دی ہے اور اس کو با اثر سمجھا ہے۔

شمع روتی ہے بہت اس کو اٹھالے کوئی
بیٹھ جائے نہ کہیں کچی ہے تربت میری

اپنے بیگانے کو روتے ہی کٹی عمر امیرؔ
کبھی دشمن کے کبھی دوست کے ماتم میں رہے

امیرؔ مینائی کے کلام میں حُسنِ بندش، نُدرت خیالی اور حکمت جابجا پائی جاتی ہیں۔ آپ نے اس سے گلشن ادب میں وہ گلہائے رنگیں کھلائے جس سے گلشن ادب مہک اٹھا۔ لہٰذا آپ بھی ان پھولوں کی رنگینی اور مہک سے لطف اندوز ہوں۔ امیرؔ مینائی کی ندرت خیالی ملاحظہ ہو۔

راہی ہیں صبح و شام مسافر سُوئے عدم
ہوتی نہیں ہے شب کو بھی یہ شاہراہ بند

نظر اپنی پہنچتی ہے شعاع مہر کی صورت
بھروسہ آپ ناحق کرتے ہیں پردے کا چلمن پر

ہماری مستی تو دیکھ زاہد کہ بت کدے میں شراب اگر پی
ہوئی یہ نشے سے لغزشِ پا حرم میں ہم جا گرے بہک کر

اس کی حسرت ہے جسے دل سے مٹا نہ سکوں
ڈھونڈنے اس کو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں

التجا ٹوٹے ہُوے دل کی وہاں ہے مقبول
درد کی ساری ہے تاثیر مناجاتوں میں

امیرؔ مینائی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑے گہرے تاثرات کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

زندگی بھر رہا جامہء عریانی میں
مرگ کے بعد ہے کیا کام کفن پوشی سے

جو آتا ہے وہاں سے چیتھڑا تن پر نہیں ہوتا
عدم میں بھی الٰہی کیا کوئی ننگوں کی بستی ہے

نہ سنی گورِ غریباں میں کسی نے فریاد
کتنے بے درد ہیں اس شہر کے رہنے والے

چلتے ہو ساتھ میرے جنازے کے ہے یہ خوف
ایسا نہ ہو کہ لحد پہ قیامت بپا کرو

نزع میں کیا نظر آتا ہے کوئی برق جمال
آنکھیں کر لیتے ہیں کیوں بند یہ مرنے والے

امیرؔ مینائی محبت سے یہ گلہ کرتے ہیں کہ یہ کیسا انصاف ہے کہ:

کوئی پوچھے تو محبت سے یہ کیا ہے انصاف
وہ مجھے دل سے بھلائے میں بھلا بھی نہ سکوں

میرے والد محترم پروفیسر حبیب اللہ خان صاحب

م۔ جاوید

میرے شفیق والد مکرم پروفیسر حبیب اللہ خان صاحب کی وفات ۱۳ جنوری ۱۹۹۷ء کو رمضان شریف کے بابرکت مہینہ میں ربوہ میں ہوئی۔ میرے ابو برصغیر کے معروف خاندان سے تعلق رکھنے والے بزرگ حضرت مولانا ذوالفقار علی خان گوہرؔ کے صاحبزادے تھے اور ان خوش نصیبوں میں سے تھے جن کا نام سیدنا حضرت اقدس مسیح موعودؑ نے عطا فرمایا تھا۔ آپ کے والد صاحب نے دس برس کی عمر میں آپ کو قادیان بھجوا دیا تھا۔ آپ نے میٹرک کا امتحان قادیان سے دیا پھر F.Sc اور B.Sc اسلامیہ کالج لاہور سے کی۔ M.Sc کی ڈگری آپ نے علی گڑھ سے ۱۹۳۱ء میں حاصل کی اور ملازمت کے لیے حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہاں پھر مدرسہ عالیہ میں سائنس ٹیچر مقرر ہوئے جو ایچی سن کالج طرز کا ادارہ تھا جہاں افسران اور جاگیرداروں کے بچے پڑھتے تھے، وہاں سولہ سال رہے۔ ابا جان بتاتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حیدر آباد سے مجلس مشاورت پر بطور نمائندہ قادیان گیا تو حضرت مصلح موعود نے دورانِ کلام فرمایا "پروفیسر حبیب اللہ آئے ہوئے ہیں"۔ پھر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی جانب سے ایک کارڈ پہنچا کہ تعلیم الاسلام کالج لاہور میں B.Sc کی کلاسز شروع ہو گئی ہیں۔ سٹاف کی ضرورت ہے۔ آپ قادیان پہنچ کر رپورٹ کریں۔
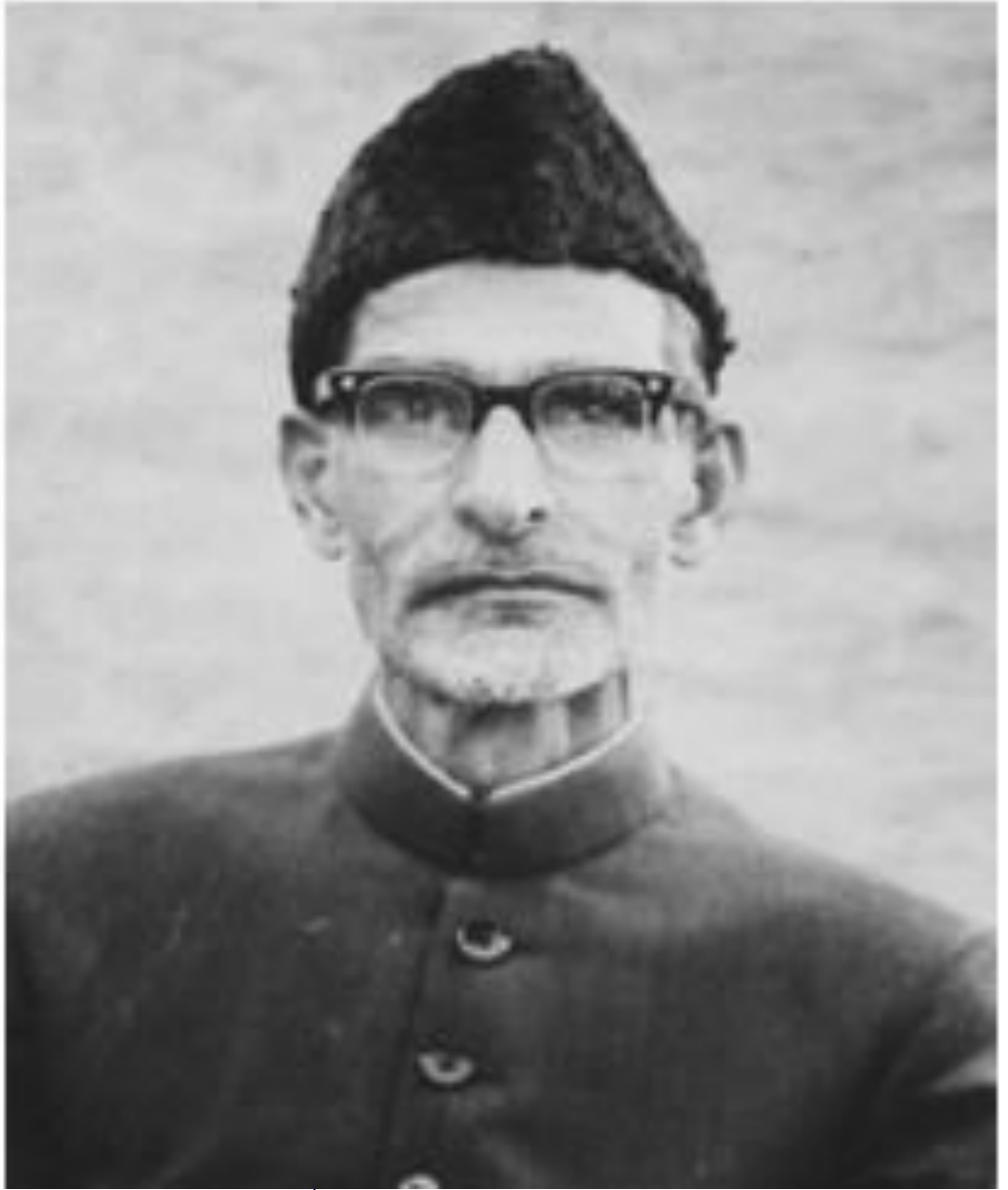
اس دوران ملک تقسیم ہو چکا تھا اور حیدر آباد سے آنا مشکل تھا لیکن خدا نے جو ہر مشکل میں بندوں کے کام آنے والا ہے اس کا انتظام بھی کر دیا۔ حیدر آباد میں ہی سیٹھ محمد اعظم صاحب کے مکان پر ایک کیپٹن سے ملاقات ہوئی اور لاہور جانے کے بارہ میں ذکر ہوا، اس نے کہا آپ بطور بیرہ کے فوج کے ساتھ آرمی شپ میں جا سکتے

ہیں۔ آپ نے فوراً اس بات کی حامی بھر لی۔ اس طرح بمبئی اور پھر کراچی سے سانگلہ ہل تک ان کے ساتھ رہے۔ آخر کار لاہور پہنچ گئے۔ ٹی آئی کالج اس وقت لاہور میں تھا۔ حضرت مرزا ناصر احمد صاحب (خلیفۃ المسیح الثالث) کالج کے پرنسپل تھے۔ لہٰذا اسٹاف میں شامل کر لیا گیا۔

آپ اڑھائی تین میل روزانہ سائکل پر کالج جاتے۔ وقت کی پابندی کو ضروری سمجھتے۔ نیز طلبا کی تعلیمی سرگرمی پر ہمیشہ نظر رہی۔ اکثر طالب علم کو کالج ٹائم کے بعد بھی وقت دیتے۔ آپ کی تنخواہ معمولی تھی اور نو(۹) بچوں کے ساتھ گزر بسر بڑی مشکل تھی۔ گھر کیا تھا، ایک کمرہ کچن اور مختصر سا صحن، وہ بھی اوپری منزل پر، برسات میں پانی سیدھا کمرہ میں آ جاتا۔ اگر رات ہوتی تو اور بھی دقت پیش آتی کیونکہ گھر میں واحد چارپائی اور تین صندوق۔ رات اس پر بیٹھ کر گزارنی پڑتی۔ ہم بہت چھوٹے تھے لیکن ذہن میں وہ نقشہ ابھی تک یاد ہے، ابو امی صبح صبح اٹھتے۔ نماز قرآن سے فارغ ہونے کے بعد ناشتہ کی تیاری کرتے۔ اس زمانہ میں لکڑیوں سے چولہا جلا کرتا تھا۔ باری باری سب بچوں کو اٹھاتے نماز پڑھنے کا کہتے اور سکول کی تیاری میں ابا جان ہماری مدد کرتے۔ ناشتہ سے فارغ ہونے پر زینے سے نیچے تک چھوڑنے آتے۔ یہ سب کام جلدی جلدی کرتے کیوں کہ انہوں نے بھی وقت پر کالج پہنچنا ہوتا تھا۔ ایک لالٹین کے گرد سب بچوں کو پڑھاتے۔ چھٹی کے روز لارنس گارڈن کی سیر پر بھی لے جاتے، راستہ بھر چھوٹے چھوٹے واقعات سچائی اور بہادری سے متعلق بتاتے۔

ایک مرتبہ ہمارے سکول کی دوست جو غیر از جماعت تھی اس نے ہمارے گھر آنے کی خواہش ظاہر کی اور سکول کے بعد پروگرام بنا لیا۔ جب کھیتوں کے بیچ سے گزر کر گھر جا رہے تھے تو کہنے لگی۔ سنو یہاں درختوں پر چڑیلیں تمہارا نام لے کر پکار رہی ہیں۔ جب ہم نے غور کیا تو ہمیں بھی کچھ سنائی دینے لگا۔ وہ تو آدھے راستے سے واپس چلی گئی اور ہم بھی ایک لمبا راستہ کاٹ کر گھر پہنچے۔ اگلے روز ہم نے سکول جانے سے انکار کر دیا۔ جب ابا جان نے وجہ پوچھی تو سب بات کہہ ڈالی۔ ابا جان کہنے لگے چلو میرے ساتھ! اور راستے میں کہنے لگے کہ کیا اب تمہیں وہ آوازیں آ رہی ہیں؟ تو ہم نے انکار میں سر ہلایا۔ کہنے لگے تمہاری دوست کا صرف وہم تھا۔ اس کے گھر میں ایسی باتوں کا ذکر ہوتا ہو گا جو اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ورنہ کوئی چڑیلیں وغیرہ نہیں ہوتیں اور جب گھر سے نکلا کرو تو دعا ضرور پڑھا کرو۔ سورتیں دہراتی رہا کرو۔ یوں ہماری تربیت کا ہمیشہ خیال رکھا۔

میرے ابو بڑے صابر بڑے ہمت والے انسان تھے۔ تنگی و خوشحالی، غمی و خوشی ہر دور سے گزرے اور اس کو معمول کا حصہ سمجھا۔ مجھے یاد ہے ایک دن ہمیں گندم ابال کر کھانی پڑی۔ ہم نے کہا، یہ کیا ہے؟ کہنے لگے یہ بھی کھانے کی چیز ہے۔ اگلے روز امی جان کے کہنے پر کہ سنو جی! آج تو کھانے کو کچھ بھی نہیں۔ کہنے لگے جانتا ہوں لیکن کیا کروں۔ دست سوال کرنا طبیعت پر بار معلوم دیتا ہے۔ پھر کچھ توقف کے بعد سائکل پکڑی اور باہر نکل گئے۔ جاتے ہوئے امی جان سے کہا تو بھی دعا کر و اللہ بہتر بندوبست کرے گا۔

ابو بتاتے ہیں کہ ابھی میں بازار سے گزر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی خان صاحب رکیے۔ آپ سائکل سے اترے اور وجہ دریافت کرنے پر کسی نوجوان لڑکے نے کہا۔ خان صاحب میں نے آپ سے ٹیوشن پڑھنی ہے۔ امتحان قریب ہیں۔ آپ نے کہا ٹھیک ہے۔ کالج کے بعد میرے پاس آ جانا۔ اس نے جیب سے پیسے نکالے اور دینے لگا۔ ابا جان نے کہا کہ ابھی تو پڑھانا شروع نہیں کیا۔ جب پڑھاؤں گا تب ہی لوں گا۔ لیکن وہ بصد اصرار رقم آپ کے ہاتھ میں تھما گیا۔ ابا جان نے انہی پیسوں سے گھر کا سودا وغیرہ خریدا۔ یوں خدائے مہربان نے غیب سے سامان پیدا کر دیا۔

جب کالج ربوہ شفٹ ہو گیا تو آپ بھی ربوہ چلے آئے۔ یہاں پر خدا نے اپنا چھوٹا سا گھر بنانے کی توفیق دی۔ آپ تعلیم الاسلام کالج کے شعبہ کیمسٹری کے پروفیسر تھے۔ نصرت گرلز کالج میں جب سائنس کا شعبہ قائم ہوا تو وہاں پر بھی خدمات انجام دیں۔ آپ ناظم امتحانات بھی رہے ہیں اور بڑی دیانتداری سے پرچے چیک کرتے بلکہ اکثر اوقات ہمیں کہتے کہ ذرا تم بھی دوبارہ سے چیک کرو، کہیں غلطی تو نہیں رہ گئی۔ خوب تسلی کر لیتے، مبادا کسی سٹوڈنٹ کی سال بھر کی محنت رائیگاں نہ جائے۔ جن دنوں پرچے آتے تو اکثر سٹوڈنٹ دوسرے شہروں سے اپنے والدین کے ساتھ یا پھر اکیلے ہی آتے کہ اگر نمبروں میں کمی ہو تو پوری کروالیں مگر میرے ابو اس معاملے میں اصول کے بہت پابند تھے۔ انہوں نے کبھی ایسا نہ کیا۔ وہ کہتے تھے جتنی محنت وہ اس بات کے معلوم کروانے میں کہ فلاں پرچہ کس کے ہاتھ گیا ہے اگر پڑھائی میں ذرا سی محنت کرتے تو یوں خواری نہ اٹھانی پڑتی۔ ہمیں بھی دل لگا کر پڑھنے کی تلقین کی۔

پیارے ابو جان کو باغبانی کا بہت شوق تھا اور ایک حصہ پلاٹ میں خوب سبزیاں پھل اور سفیدے کے درخت لگائے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ پرنسپل صاحب

حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کو چند اساتذہ کے ساتھ گھر پر مدعو بھی کیا اور اپنا باغیچہ دکھایا۔ حضرت صاحب دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ساتھ ہی فرمایا! خان صاحب آپ کے باغیچہ میں ٹماٹر تو بہت بہار دکھارہے ہیں۔ آپ جلسہ سالانہ پر ناظم مکانات بھی رہے۔ جلسہ شروع ہونے سے بہت پہلے ہی لوگوں کے خطوط آنے شروع ہو جاتے۔ آپ ہر کام نہایت جانفشانی سے سرانجام دیتے۔ آپ کا اپنا گھر بھی جلسے کے ایام میں مسیح کے مہمانوں سے بھرا ہوتا۔ رشتے داروں کی اولین خواہش ہوتی کہ آپ کے گھر رہا جائے۔ آپ اس میں بڑی راحت محسوس کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ تو پچاس کے قریب لوگ تھے۔ لہٰذا گھر میں ہی چھولداری لگوانی پڑی۔ اباجان کا بستر ان دنوں میں کچن میں لگا کرتا تھا۔ آپ صبح صبح مہمانوں کے لئے گرم پانی کا بندوبست کرتے تاکہ مہمانوں کو ٹھنڈے پانی سے منہ نہ دھونا پڑے۔ برابر کے چولہے پر چائے بناتے۔ رات کی بچی لنگر کی روٹیاں سالن گرم کر کے دیتے رہتے۔ کہتے تھے کہ مسیح کے مہمانوں کا خیال رکھنا ہم پر فرض ہے۔ جلسہ کے ایام میں کیا خوب گہما گہمی رہتی۔ دن کو جلسہ کی کارروائی سنی جاتی تو رات کو دن بھر کی کارروائی پر تبادلہ خیال ہوتا۔ ایک دو مرتبہ تو رات کو گھر پر شاعری سن کر بھی لطف اٹھایا گیا۔ وہ اس طرح کہ ہمارے پھوپھا جان حکیم خلیل احمد مونگھیری صاحب نے اپنے اشعار سنائے اور خوب داد موصول کی۔ خالصتاً روحانی ماحول ہوتا۔ اب تو وہ زمانہ خواب معلوم دیتا ہے۔

ہمارے گھر جب کبھی شادی کی تقریب منعقد ہوتی تو ابا جان خاندان مسیح موعود کے افراد کو ضرور دعوت نامہ بھجواتے اور ان کی محبت وخلوص دیکھئے کہ کچھ تو آکر رونق بخشتے اور جو نہیں آسکتے بوجہ مجبوری جوابی لفافہ ضرور ارسال کرتے۔ میرے بھائی جان کلیم اللہ خان کی شادی کی تقریب پر تو حضرت مسیح موعود کی دختر حضرت نواب مبارکہ بیگم صاحبہ تشریف لائیں۔ میری بھابی نصیرہ خاں صاحبہ کو لفافہ ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہنے لگی تمہیں معلوم ہے کہ کس خاندان میں بیاہ کر آئی ہو۔ یہاں تو اردو بولی جاتی ہے۔ لہٰذا اب اسی زبان کو رواج دینا۔ اس طرح حضرت چھوٹی آپا، حضرت مہر آپا اور کئی افراد خاندان مسیح موعود نے اس چھوٹے سے گھر کو زینت بخشی۔ اباجان کے پاس بھی اکثر ہی خاندان مسیح موعودؑ کے احباب ملاقات کے لئے آتے اور دعا کی درخواست کرتے۔ آپ کو ان سے مل کر بہت خوشی ہوتی۔ یہ سب تعلق خلوص و پیار کا جماعت کی برکات کے طفیل ہی سے ہے۔

جن دنوں ابا جان ہوسٹل کے وارڈن تھے اور کالج میں ہی قیام تھا، بتایا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے بڑی بھاری ذمہ داری سونپی ہے۔ دعا کرو میں اس پر پورا اتر سکوں۔ ہم نے دیکھا اباجان رات کا اکثر حصہ نماز پڑھتے دعاؤں میں گزارتے۔ ایک مرتبہ ہمیں خط دیا کہ حضرت نواب امتہ الحفیظ بیگم صاحبہ کو دے آؤ۔ جب ہم گئے تو انہوں نے اسی وقت کھول کر پڑھا اور کہنے لگیں۔ خان صاحب سے کہنا اب ان کا بیٹا جہاں جاب کے لئے جارہا ہے وہاں سے ریٹائر ہو کر ہی نکلے گا۔ وہ بات جو آپ کی زبان مبارک سے نکلی ویسے ہی پوری ہوئی۔ دراصل میرے بھائی کسی جگہ بھی جم کر کام کرنے کے عادی نہ تھے۔

پیارے اباجان کو کئی مرتبہ اعتکاف بیٹھنے کا موقع ملا۔ کبھی بیت مبارک تو کبھی محلے کی بیت میں۔ رمضان شریف کے روزے سے بڑی باقاعدگی سے رکھتے رہے بلکہ شوال کے روزے بھی رکھتے تھے۔ یہ سلسلہ ان کی وفات سے دو تین سال پہلے تک چلا۔ جمعہ کی نماز میں بھی باقاعدگی تھی لیکن جب صحت خراب رہنے لگی تو جانا چھوڑ دیا۔ ہمیں کہتے۔ دیکھو آپ لوگ جمعہ پر جارہے ہو غور سے خطبہ سننا پھر آکر مجھے بتانا کہ کس بارہ میں خطبہ دیا گیا۔ لہٰذا ہم بھی بڑی توجہ سے سنتے اور یوں ہماری بھی جمع کی نماز میں باقاعدگی ہونے لگی۔ ابا جان کو محلے داری کا ہمیشہ ہی خیال رہا جہاں دیکھتے کوئی مستحق ہے تو اس کی یوں امداد کرتے کہ دوسرے کو خبر بھی نہ ہوتی۔ ہماری دوست کبھی ہماری غیر موجودگی میں ملنے چلی آتی تو خود اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر دیتے۔ بعد میں وہ ہمیں بتاتیں کہ تمہارے ابا نے ہمارا اتنا خیال رکھا۔

پیارے اباجان کو اپنے کئی پیاروں کے جدائی کے صدمات بھی سہنے پڑے لیکن صبر و تحمل سے برداشت کرتے رہے۔ اباجان کی وفات بھی کچھ اس رنگ میں ہوئی کہ ہم سب کو ہی حیران کر گئی۔ دراصل بیمار تو میری والدہ صاحبہ اور ہسپتال میں داخل تھیں ایک دن ڈاکٹروں نے کہا کہ اب ان کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ ان کے جو بچے باہر ہیں اطلاع کر دو۔ ہم نے یہ بات سنی تو دل پریشان ہو گیا۔ اباجان کو بتایا تو انہوں نے ہمیں اپنے پاس بٹھایا، تسلی دی اور ساتھ ہی کہا کہ باہر بچوں کو اطلاع ضرور بھجوادو جس نے آنا ہے آجائے۔ کہنے لگے۔ دیکھو میں ابھی انہیں کو خط لکھ رہا تھا۔ ابھی تھوڑا ہی لکھا کہ آگے قلم ہی نہیں بڑھ رہا تھا لہٰذا چھوڑ دیا۔ میری بڑی بہن کو کہا کہ بینک سے کچھ رقم بھی نکلوالو شائد ضرورت پیش آجائے۔ خدا کا کرنا دیکھئے می جان کو جب فضل عمر ہسپتال دیکھنے گئے تو وہ اپنے بستر پر ہی ٹھیک ٹھاک بیٹھی ہیں اور ڈاکٹر سے گھر جانے کی اجازت مانگ رہی تھیں۔ ڈاکٹروں نے بھی کہا آپ انہیں

باقی صفحہ ۱۸ پر
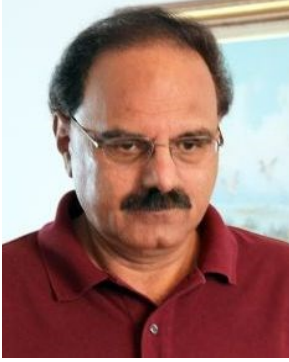
اُردو املا

سفیر رامہ

(المنار کے لیے موصول ہونے والے مضامین میں زیادہ تر املا کی غلطیاں ہمزہؔ کے استعمال میں دکھائی دیتی ہیں جو غالباً املا کے قواعد سے بے توجہی کا نتیجہ ہیں۔ ہمزہؔ کے استعمال کے چند بنیادی قواعد درجِ ذیل ہیں۔اس مضمون کے لیے جن کتب سے استفادہ کیا گیا ہے ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر رشید حسن خان صاحب کی معرکہ آرا تصنیف 'اُردو اِملا' ہے)

ہمزہ اور واو

(۱) جن لفظوں کے آخر میں واوؔ ہو، اور واوؔ سے پہلے کوئی حرفِ علّت ساکن ہو، اس صورت میں واوؔ پر ہمزہؔ نہیں لکھا جائے گا۔

جیسے ایک لفظ ہے: پاوؔ (سیر کا چوتھائی حصہ)۔ یہاں آخری حرف واوؔ ہے اور اس سے پہلے الفؔ ہے۔ اگر اس کو "پاؤ" لکھا جائے تو وہ تین حرفی لفظ (پاو)، اب چار حرفی بن گیا (پاءو) اور اب یہ پاناؔ مصدر کا فعل ہو گیا، جاؤ، آؤ، کھاؤ کی طرح۔ یعنی ایک لفظ جو اسم تھا، فعل میں تبدیل ہو گیا۔ ذیل میں ایسے کچھ لفظ لکھے جاتے ہیں، ان سب میں، اور اِن کی قبیل کے اور سب الفاظ میں، واوؔ پر ہمزہؔ کبھی نہیں لکھا جائے گا:

الاو، اودبلاو، بھاو تاو، پاو، پُلاو، تاو، چاو، گھاو، واو،، ہواو، پتھراو، سُتھراو، ناو، برتاو، سبھاو، پیچ بچاو، پڑاو۔

(۲) بہت سے حاصل مصدر بھی اسی انداز کے ہیں، جیسے: بچاو، بہاو، دباو، وغیرہ۔ اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ ایسے افعال میں ہمیشہ ہمزہؔ آئے گا، مگر حاصل مصدر ہمیشہ ہمزہؔ سے محفوظ رہیں گے۔ جیسے ایک مصدر ہے: گھٹانا، اس سے فعل بنے گا: گھٹاؤ، اور حاصل مصدر بنے گا: گھٹاو۔ "جوڑ گھٹاو" میں یہی حاصل مصدر ہے۔ یا جیسے گھُماناؔ اور پھراناؔ، دو مصدر ہیں، ان سے فعل بنیں گے: گھماؤؔ اور پھراؤؔ۔ اور ان کے حاصل مصدر ہوں گے: گھماوؔ اور پھراوؔ۔ یا جیسے دبانا سے دباؤ فعل ہو گا اور دباوؔ حاصل مصدر ہو گا۔ مثلاً یہ جملہ: ذرا زور سے دباؤ، اس میں "دباؤ" فعل ہے۔ اور مثلاً یہ جملہ: لڑکے ماں باپ کا دباو نہیں مانتے، اس میں "دباو" حاصل مصدر ہے۔

ان جیسے کچھ حاصل مصدر یہ ہیں:

اُلجھاو، اٹکاو، بناو (بناو سنگار) بہاو، بچاو، بھراو، بہکاو، پٹاو، پھنساو، تناو، ٹکراو، ٹھہراو، جھکاو، جماو، چڑھاو، (اُتار چڑھاو۔ دریا چڑھاو پر ہے) چُھواو، چھڑکاو، چُناو، چلاو (چل چلاو) چھنٹاو، دباو، ڈھلاو، رکاو، کساو، کٹاو، (جیسے دریا کا کٹاو)، گٹھاو، گھُماو (گھُماو پھراو) گھٹاو، گراو، گھِراو (مزدوروں نے مینیجر کا گھِراو کیا)۔ لداو (جیسے: لدو کی چھت)، نبھاو، لگاو۔

غالبؔ کا معروف شعر ہے:

لاکھوں لگاو، ایک چُرانا نگاہ کا
لاکھوں بناو، ایک بگڑنا عتاب میں

اس میں "لگاو" اور "بناو" دونوں حاصل مصدر ہیں، اگر ان کو "لگاؤ" اور "بناؤ" لکھا جائے، تو یہ فعل بن جائیں گے اور شعر کے معنی ہی چوپٹ ہو جائیں گے۔ جیسے تلوار کی تعریف میں میر انیسؔ کا یہ بے مثال شعر:

شرّاف کا بناو، رئیسوں کی شان
شاہوں کی آبرو ہے، سپاہی کی جان ہے

(۳) بگاڑوؔ، لڑاکوؔ، اُجاڑوؔ کی طرح کے جتنے اسمِ فاعل ہیں (اور بعض اسمِ مفعول بھی)، ان کے آخر میں واوِؔ معروف ہوتا ہے۔ قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ واوؔ اور الفؔ کے بیچ میں ایک اور حرف ہوتا ہے، جس پر پیش ہوتا ہے۔ اس طرح کے کچھ اسمِ فاعل ایسے بھی ہیں جن میں واوؔ اور الفؔ کے بیچ میں، کسی اور حرف کے بجائے، ہمزہؔ ہوتا ہے، جیسے: کماؤ، اُڑاؤ (واوِ معروف کے ساتھ)۔

اس طرح کے جتنے اسمِ فاعل ہیں، ظاہر ہے ان سب میں واوؔ پر ہمزہؔ لکھا جائے گا۔ خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ ایسے جتنے حاصل مصدر ہیں، ان پر ہمزہؔ کبھی نہیں آئے گا۔ اس کے برخلاف، اس طرح کے جس قدر اسمِ فاعل (یا اسمِ مفعول) ہیں،

ان سب پر ہمزہ لازماً لکھا جائے گا۔ تلفّظ میں ایسے لفظوں میں واوِ معروف کی آدھی سے کچھ زیادہ آواز نکلتی ہے۔ جیسے:

کماؤ پوت، ہاتھی ڈباؤ پانی، ٹِکاؤ کپڑا، جڑاؤ زیور، بِکاؤ مال، اُٹھاؤ چولھا (وہ آدمی جو ایک جگہ نہ ٹکے، مارامارا پھرے)، پیاؤ پر بھیڑ لگی ہے۔ جُتاؤ زمین، وہ تو بڑے لُٹاؤ ہیں، باپ کی ساری پونجی برباد کر دیں گے، وہ بناؤ نہیں، بگاڑو ہیں۔

اب مختصراً ان تینوں قاعدوں کو پھر دُہرایا جاتا ہے:

(الف) ایسے حاصل مصدر جن کے آخر میں واو ہو، اور اس سے پہلے الف ہو، اس واو پر ہمزہ کبھی نہیں آئے گا، جیسے: بناو، بچاو، گھماو، دباو، لگاو وغیرہ۔

(ب) ایسے اسم فاعل (اور بعض اسم مفعول) جتنے ہیں، ان میں واو پر ہمزہ ضرور آئے گا، اور یہاں واو معروف ہو گا، جیسے: بکاؤ (بِکاءُو)، پلاؤ (پلاءُو) جیسے: پلاؤ جانور وغیرہ۔

(ج) ایسے افعال پر ہمزہ ضرر آئے گا، جیسے: آؤ، جاؤ، بناؤ، لاؤ، پاؤ، کھاؤ، اُڑاؤ، کماؤ، جماؤ، اُگاؤ۔ اور یہاں واوِ مجہول کی آواز نکلے گی۔

(۴) مندرجہ ذیل الفاظ میں بھی واو ساکن ہے اور اس سے پہلے نونِ غنّہ ہے، اور یہاں بھی ہمزہ نہیں آئے گا:

گانو، پانو، چھانو، دانو، کھڑانو، ٹھانو، انانو۔

(۵) ذیل کے الفاظ میں بھی آخری حرف واو ہے۔ اس سے پہلے یے ساکن ہے، یہاں بھی ہمزہ نہیں آئے گا:

دیو، ہادیو، بلدیو، جے دیو، دیوتا، دیو کی نندن، دیو، خدیو، جنیو،

(۶) مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفّظ، مندرجہ بالا الفاظ کے تلفّظ سے ذرا سا مختلف ہے، یہ سب لفظ بھی ہمزہ کے بغیر لکھے جائیں گے:

(الف) پیو (پیا کی ایک صورت)، جیو (جیسے: شیخ جیو)، نیو، میو (ایک نام میوات کے رہنے والے لوگ) کرفیو، ریویو۔

(ب) بیورا، تیورا، نیولا، سیوڑھا، دیونی، دیوتا، سیوتی، ریوتی، کیوڑا، دیوڑھا، پیوسی، بیوہار، بیوپار، تیوہار، بیوپاری، دیولالی، نیوتا، چیونٹی۔

ان کی جمع کی صورت یہ ہو گی:

تیوہار : تیوہاروں

ڈیورھا: ڈیوڑھوں

نیولا : نیولوں

دیوتا : دیوتاؤں

نیوتا : نیوتوں

دیونی : دیونیوں

(۷) سِوا، ہَوا، سُوا، یہ تین لفظ بہ طورِ مثال لکھے گئے ہیں۔ پہلے لفظ میں واو سے پہلے والے حرف پر زیر ہے، اور دوسرے لفظ میں ما قبلِ واو مفتوح ہے، ان دونوں لفظوں میں واو کا تلفّظ صاف اور واضح ہے۔ اس طرح کے لفظوں کے املا میں عموماً غلطی نہیں ہوتی۔ تیسرے لفظ میں واو سے پہلے والے حرف پر پیش ہے، اس طرح کے لفظوں میں واو کی آواز صاف صاف نہیں نکلتی، اس طرح جیسے ہَوا اور دَوا اور سِوا جیسے لفظوں میں نکلتی ہے، بلکہ ایسے لفظوں میں الف اور واو کی آواز ایک دوسرے میں آمیز ہو جاتی ہے، اور جس طرح یاے مخلوط کی آواز نکلتی ہے، اسی طرح یہ واو تلفّظ میں آتا ہے۔ اس کو آسانی کے لیے، یاے مخلوط کی طرح، واوِ مخلوط کہا جا سکتا ہے۔ ایسے لفظوں کے لکھنے میں کبھی کبھی یہ غلطی ہو جاتی ہے کہ واو پر ہمزہ بھی لکھ دیا جاتا ہے، حالاں کہ یہ درست نہیں۔ ایسے سب لفظوں میں صرف واو لکھا جائے گا، ہمزہ ہرگز نہیں ائے گا۔ ایسے کچھ لفظ یہ ہیں:

(الف) بُوا، سُوا، تُھوا، جُوا، پُھوا، جوالا، جوالا مکھی، سوارت، کوالٹی، کواٹر، گوُالا، جُوار، دُوار، کُنوارا، بُھوار، پُھوارا، چھُوارا، چُوا۔

(ب) ہُوا، چُھوا، مُوا، چُوا، فعل ہیں۔ ہُوا کی دوسری صورتیں ہیں: ہوئی، ہوئے، ہوؤں۔ ان سب صورتوں میں ہمزہ آتا ہے، اسی طرح جس طرح ایسے اور فعلوں کے مشتقّات میں آتا ہے، مگر ہُوا کو ہمزہ کے بغیر ہی لکھا جاتا ہے۔ یہ استثنا ہے۔ یہی صورت باقی تین افعال کی ہے کہ ان کے مشتقّات میں بھی ہمزہ آتا ہے، اس طرح:

ہوا، ہوئی، ہوئے، ہوؤں (مارے ہوؤں)۔

مُوا، موئی، موئے، موؤں۔

چُھوا، چوئی، چھوئے۔

(۸) ذیل میں جو لفظ لکھے جا رہے ہیں، یہ سب، اور ان کی طرح کے اور لفظ بھی، ان سب میں واو پر ہمزہ نہیں لکھا جائے گا:

باولا، باولے، باولی، اُتاولا، اوتاولی، اوتاولے، راوٹی، چھاونی، گھناونی، گھناونا، سُناونی، گاووی، سانولی، سانولا، بکاولی، باوٹا، پھاوڑا، امراوتی۔

جن اسموں میں آخری حرف الف ہے، اور اس سے پہلے واو ہے، ان کی جمع

اس طرح بنے گی کہ الف ؔہٹ جائے گا اور ''ون'' یا ''ے'' کا اضافہ کیا جائے گا۔ محرّف صورت میں بھی ''ے'' کا اضافہ کیا جائے گا۔ جیسے: بچھوآ کی جمع بچھوے ؔاور بچھووں ؔبنے گی۔

اس کے بر خلاف، جن اسموں کے آخر میں واوِ معروف ہے، اور اس سے پہلے کوئی حرفِ صحیح ہے، اس صورت میں جمع کے لیے ''ؤں'' (ءوں) کا اضافہ کیا جائے گا۔ جیسے: بچھو ؔ سے بچھوؤں، چاقو سے چاقوؤں، اور ہندو سے ہندوؤں۔ کچھ اور مثالیں دیکھیے۔

بہو	بہوؤں
سادھوُ	سادھوؤں
پلّوُ	پلّوُؤں
اُلّوُ	اُلّوُؤں
بازوُ	بازوؤں
خالو	خالوؤں
پہلوُ	پہلوُؤں
آلوُ	آلوؤں
آنسوُ	آنسوُؤں
جادوُ	جادوؤں
بابو	بابوؤں
چلّوُ	چلّوؤں
ڈاکو	ڈاکوؤں

(۹) جس طرح بٹوا ؔ، چھٹوا ؔاور سُور، کَنْوَر ؔدیو ؔجنیو ؔجیسے لفظوں میں واو ؔکی آواز، یاے ؔمخلوط کی طرح، نصف کے قریب نکلتی ہے، اسی طرح عربی کے کچھ لفظ ایسے ہیں جن کے تلفّظ میں بھی وہی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان سب لفظوں میں بھی واو ؔپر ہمزہ ؔہر گز نہیں لکھا جائے گا۔ ایسے کچھ لفظ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ یہ خیال رہے کہ ان سب لفظوں میں واو ؔسے پہلے والا حرف مضموم ہے۔ یہ لفظ اور ان کی قبیل کے اور سب لفظ، سب میں صرف واو ؔلکھا جائے گا:

موافق، موافقت، مواصلت، موثّر، موخّر، مودّب، موذّن، مورّخ، موقّر، موکّد، موکّل، مولّف، مولّفہ، مونّث، مویّد، مواخذہ، موازنہ، موسّس، موفّق، موجّل، موجّہ، موشّح، مورّخہ۔

موثّر، مونّث، موخّر جیسے لفظوں کو بہت سے لوگ مع اضافۂ ہمزہ ؔ''مؤثّر، مؤخّر، مؤنّث'' لکھا کرتے ہیں۔ عربی میں جو بھی صورت ہو، اردو املا کے لحاظ سے یہ غلط لکھاوٹ ہے۔ ایک حرف (واو) کی جگہ دو حرف (ءو) کیوں لکھے جائیں گے؟ ان سب لفظوں کو ہمزہ ؔکے بغیر لکھا جائے گا۔ ان لفظوں کی (اردو) جمع اس طرح بنے گی کہ ''وں'' کا اضافہ کیا جائے گا۔ ہمزہ ؔیہاں بھی نہیں آئے گا:

موذّنوں، مورّخوں، موکّلوں، مولّفوں، مویّدوں، موسّسوں۔

(۱۰) انگریزی وغیرہ کے ایسے لفظ جن میں الف ؔاور واو ؔایک ساتھ آجائیں، ان سب میں بھی واو ؔپر ہمزہ ؔنہیں لکھا جائے گا، جیسے:

الاونس، ساونڈ، گراونڈ، کمپاونڈ، کمپاوڈر، پاوڈر، راونڈ، پاونڈ، ساوتھ، ماوتھ، ماوزی تنگ، چاواِن لائی، اکاونٹ، اناونسر، اکاونٹنٹ، باونڈ،

یہ اصول ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ایک حرفِ علّت کی جگہ، دو حرفِ علّت نہیں آئیں گے۔ کوئی لفظ ہو، اور کسی زبان کا ہو، اصول یہی رہے گا۔

(۱۱) رئیس ؔکی جمع عربی کے قاعدے سے ''رُؤَسا'' ہو گی (حُکَما اور عُلَما کے وزن پر)۔ یعنی ایک واو ؔ، اس پر ہمزہ ؔاور ہمزہ ؔپر زبر۔ اس املا کو عربی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔ اردو میں سادہ طور پر رُءسا لکھا جائے گا۔ جن صاحب کو یہ صورت پسند نہ ہو، وہ زیادہ سادگی کے ساتھ اردو کی جمع ''رئیسوں'' استعمال کریں۔

(۱۲) بعض ناموں میں کبھی صرف ہمزہ ؔلکھا جاتا ہے اور کبھی واو ؔپر ہمزہ ؔلکھا جاتا ہے۔ جیسے: ثناء اللہ اور ثناؤ اللہ۔ اس سے قطعِ نظر کر کے، کہ عربی میں کیا صورت ہے، اردو میں ایسے سب ناموں میں صرف ہمزہ ؔلکھا جائے گا۔ جیسے:

بہاء اللہ، بہاء الدین، علاء الدین، ثناء اللہ، ثناء الحق، ضیاء الدین، ضیاء اللہ، عطاء اللہ، عطاء الرحمان، بقاء اللہ، زکاء اللہ، وغیرہ۔

(۱۳) عطف کی صورت میں واو ؔپر ہمزہ ؔکسی جگہ نہیں آئے گا۔ جیسے ایک مرکب ہے: جلال و جمال، یہ بات بھی خاص طور سے ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ واوِ عطف سے پہلے اگر الف ؔ، یاے ؔمعروف، یاے ؔمجہول، یا واو ؔیا ہاے ؔمختفی ہو، اس صورت میں بھی واو ؔپر ہمزہ ؔنہیں لکھا جائے گا، اور اس واو ؔکو اسی طرح لکھا جائے گا

جس طرح مثلاً جاہ و منصب، جلال و جمال، خوب وزشت وغیرہ میں لکھا جاتا ہے۔
ذیل میں ان پانچوں حرفوں کی نسبت سے کچھ مثالیہ مرکّبات لکھے جاتے ہیں۔

(الف) ایسے مرکّبات جن میں واوِ عطف سے پہلے الف ہے:

دنیا و دین، جزا و سزا، وفا و جفا، خطا و درگذر، جفا و جور، آقا و غلام، خدا اور سول، دعا و دوا، ادا و ناز، فنا و بقا، ادا و قضا، ادا و غمزہ، املا و انشا، اخفا و اظہار، ابتدا و انتہا، آبا و اجداد، دنیا و مافیہا، تمنّا و حسرت، عطا و کرم، انبیا و اولیا، ہوا و ہوس، علما و شعرا، فردا و دوش، ایما و اشارت۔

(ب) ایسے مرکّب جن میں واو عطف سے پہلے یائے معروف ہو۔ زندگی و موت، بندگی و خواجگی، آزادی و گرفتاری، ترقی و تنزلی، تجلّی و تحیّر، عاجزی و غرور، عاشقی و خودداری، بندگی و مجبوری، بے چارگی و ذلّت، بے مایگی و افلاس، رعنائی و زیبائی، گرمی و سردی، خوبی و زشتی، نیک نامی و بدنامی، مولوی و ملّا، پیری و صد عیب، تسلّی و تشفّی۔

(ج) ایسے مرکّبات جن میں واوِ عطف سے پہلے یائے مجہول ہو:

مے و جام، نے و نغمہ، پیاپے و ہر دم، مے و مینا۔

(د) وہ مرکّب جن میں جزوِ اوّل کے آخر میں ہائے مختفی ہے:

گذشتہ و آیندہ، نغمہ و رقص، کعبہ و بت خانہ، نالہ و زاری، جلوہ و پردہ، پیالہ و جام، سادہ و پُرکار، آہستہ و تیز، افسردہ و پژمردہ، دیدہ و شنیدہ، نالہ و فریاد، افسانہ و افسوں، کرشمہ و ناز، پاکیزہ و لطیف، جادہ و منزل، کلمہ و کلام، افسانہ و حقیقت، پروانہ و شمع، نامہ و پیغام، آشیانہ و قفس، بندہ و آقا، خواجہ و غلام، مرثیہ و غزل، مدرسہ و خانقاہ، مے خانہ و مسجد۔

(ہ) ایسے مرکّب جن میں واوِ عطف سے پہلے بھی واو ہوتا ہے: یعنی دو واو یک جا ہوتے ہیں۔ پہلا واو لفظ کا آخری جُز ہوتا ہے اور دوسرا عطف کا واو ہوتا ہے:

جستجو و تلاش، آرزو و تمنّا، گیسو و رُخ، بازو و سینہ، جادو و اعجاز، ہندو و مسلمان، سبو و جام، ہلاکو و چنگیز، اردو و فارسی، گفتگو و خموشی، ابرو و چشم، نشو و نما، ابرو و مژگاں، آبرو و منصب، پہلو و رخ، دیو و دو، خدیو و فغفور، ریو و ریا۔

ایک بار پھر اس بات کی تکرار کر دی جائے کہ اُوپر پانچ عنوانات کے تحت جس قدر مرکّبات آئے ہیں، ان میں عطف کے واو کے ساتھ ہمزہ نہیں آئے گا۔ اس انداز کے باقی مرکّبات کو ان پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مرکّبِ عطفی میں واو یا واو سے پہلے والے حرف پر، ہمزہ کہیں نہیں آئے گا۔

۞

بقیہ پروفیسر حبیب اللہ خان

گھر لے جاسکتے ہیں۔ ان کا اس طرح ٹھیک ہو جانا کسی معجزے سے کم نہیں۔ یوں میری والدہ گھر آ گئیں۔ میرے بھائی کلیم اللہ خان صاحب نے اطلاع دی تھی کہ وہ دو دن میں پہنچ رہے ہیں۔ ہم نے محسوس کیا کہ ابا جان ان کی آمد کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں اور بار بار ان کے بارہ میں پوچھا بھی۔ بہر حال جب میرے بھائی جان آئے تو پہلے سیدھا امی جان کا حال احوال پوچھا اور فوراً ہی ابا جان کے کمرہ میں چلے آئے۔ تقریباً آدھ پون گھنٹہ ان سے باتیں کیں۔ سب کا حال دریافت کیا، پھر ہم سے کہنے لگے۔ اس کے کھانے کا انتظام کرو۔ اتنی دیر میں میں بھی عشاء کی نماز سے فارغ ہو جاتا ہوں۔ ابھی کچھ ہی وقت گزرا کہ میری بہن بشریٰ گوہر جو اچانک ابا جان کے پاس گئیں تو انہوں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ماتھے پر رکھا اور ان کے ہاتھ کو چوما اور بس آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں، وہ گھبرا کر آئیں، سب ہی دوڑے چلے آئے۔ ڈاکٹر لطیف احمد قریشی صاحب کو بلایا گیا لیکن انہوں نے کہا کہ افسوس اب یہ اس دنیا میں نہیں رہے۔ یوں اتنے آرام سے اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے۔ باہر مقیم بھائیوں کو جب اطلاع دی گئی۔ وہ سب دم بخود رہ گئے اور سوچنے لگے کہیں ہمیں سننے میں تو غلطی نہیں لگی کیونکہ بیمار تو والدہ صاحبہ تھیں لیکن خدائی تقدیر میں جو تھا سو پورا ہوا۔

ابا جان نے تقریباً نوے سال عمر پائی۔ آپ موصی تھے۔ آپ کا وصیت نمبر ۴۳۳۶ ہے۔ اگلے روز بہشتی مقبرے میں تدفین ہوئی۔ آپ دنیاوی علوم کے علاوہ دینی خدمات بھی بجالاتے رہے۔ آپ مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ سیکرٹری مجلس کارپرداز۔ نائب ناظر مال۔ قائد تعلیم انصار اللہ۔ قائد وقف جدید و ناظم مکانات جلسہ سالانہ۔ اس کے علاوہ ایک عظیم الشان سعادت بھی ملی کہ حضرت مصلح موعودؓ نے میسور میں ہونے والے ایک مباہلہ میں آپ کو نمائندہ مقرر فرمایا! آپ کی تصانیف میں۔ "تاریخ انصار اللہ" "انصار اللہ کا بنیادی نصاب" اور کلام گوہر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے سائنسی مضامین میں "سمندر کے عجائبات" "خلاء کی تسخیر" شامل ہیں۔ آپ صاف گو، نہایت سادہ مزاج مخلص فدائی احمدی تھے۔ ہمیشہ دین کو دنیا پر مقدم رکھنے والے تھے۔ خدا سے دعا ہے کہ مولا کریم میرے پیارے والد کے درجات کو بلند تر کرتا چلا جائے اور ان کی اولاد کو بھی ان جیسی خوبیاں اپنانے کی توفیق دے۔ آمین۔ (بشکریہ الفضل ربوہ۔ ۵ ستمبر ۲۰۱۳ء)

کُوک فریدا کُوک

ڈاکٹر محمد ظفر اللہ

بہت سے لوگ ایسے بھی ہماری زندگی میں آتے ہیں جن سے ہمارا کوئی جسمانی رشتہ نہیں ہوتا۔ لیکن وہ کوئی ایسی بات کہہ جاتے ہیں، کر جاتے ہیں، یا ان سے منسوب کوئی ایسی بات ہم تک پہنچتی ہے جو کہ ہماری سوچوں کو ایک نیا رخ دے دیتی ہے اور گویا ہماری زندگیوں کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ اس نشست میں میں ایک ایسی ہی شخصیت اور ایک ایسی ہی بات کا ذکر کروں گا۔

جب سن ۱۹۵۷ء میں ہم لوگ اپنے آبائی گاوں کوٹلی لوہاراں پہنچے تو وہاں ہمارے خاندان کے گھروں کے علاوہ ایک اور احمدی گھرانہ بھی رہتا تھا۔ اس گھرانے کے سربراہ تھے تایا یوسف، ہم نے ان کو تایا یوسف اس لیے کہنا شروع کیا کہ ہمارے تایازاد سب کے سب ان کو چاچا یوسف کہتے تھے۔

مجھے اور گھرانوں کا اتنا علم نہیں ہے لیکن ہمارے گھرانے کی یہ ریت رہی کہ اپنے سے بڑوں کو ہمیشہ کسی مناسب رشتے سے پکارتے تھے۔ مثلاً ہم نے اپنے گھر میں کام کرنے والی عیسائی خاتون کو ہم چھوٹوں نے ہمیشہ چاچی رکھی پکارا اور گھر کے نائی کو ہمیشہ چاچا جی ہی کہا۔ اس لیے، بغیر کسی رشتے کے ہم ان کو تایا جی کہتے تھے اور انکی بیگم کو تائی جی۔ ہم گاوں آنے کے کچھ عرصے کے بعد ہی ان کے بچوں کے ساتھ گھل مل گئے تھے۔ انکا بیٹا ناصر احمد مجھ سے کوئی دو ڈھائی سال ہی چھوٹا تھا لیکن جب میں نے اسکول جانا شروع کیا تو وہ میرا دوست ہی بن گیا، حالاں کہ وہ مجھ سے دو تین کلاسیں آگے تھا۔

تایا یوسف کے ہمارے گاوں آنے کی بھی ایک کہانی تھی۔ ساری عمر کسی باہر کے ملک میں ملازمت کر کے جب لدے پھندے پاکستان آئے تو انکو اپنی جمع پونجی کو کسی کاروبار میں لگانے کی سوجھی۔ ایسے میں کہیں میرے تایا عبد الخالق صاحب سے بھی ملاقات ہو گئی۔ اور تایا جی نے انکو بیلے میں اراضی ٹھیکے پر لینے کا مشورہ دیا۔ بیلے سے مراد دریائے توی کے آس پاس کا جنگل تھا ہیڈ مرالہ کے قریب۔

تایا جی کی منطق اس حد تک تو درست تھی کہ زمین زرخیز ہے اور اگر جدید مشینری سے زمین تیار کر کے کاشت کی جائے تو سونا اگلے گی۔ لیکن قدرتی آفات یعنی سیلاب وغیرہ کی طرف انکی توجہ نہ گئی۔ خیر تو جب ہم گاوں پہنچے تایا یوسف بہت سارا نقصان اٹھا چکے تھے، لیکن چونکہ زمینیں ایک خاص مدت کے لیے پٹے پر لی تھیں، اس لیے مارے باندھے لگے ہوئے تھے۔ تایا عبد الخالق صاحب کا عمل دخل تقریباً ختم ہو چکا تھا۔

اتنا ڈھیر سارا روپیہ ضائع ہونے کا اور پھر انہی زمینوں پر ایک بچے کی وفات کا ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ اثر تو ہوا ہو گا۔ انکی بیگم تو اکثر شکوہ کرتی سنائی دے جاتی تھیں، لیکن ان کو ہم نے ہمیشہ ہنستے مسکراتے ہی دیکھا۔ یہ نہیں کہ ان کو غصہ ہی نہیں آتا تھا۔ انہوں نے جو گھر کرائے پر لے رکھا تھا اس کی دیوار ہمارے گھر کے ساتھ ہی تھی۔ اس لئے ادھر سے گزرتے ہوئے، کبھی کبھار ان کے اونچا بولنے کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ غرضیکہ ایک نارمل آدمی تھے۔

تایا یوسف نے پرانے زمانے میں بی ایس سی کیا تھا، ریاضی کے ساتھ، ناصر کو اگر کبھی ضرورت پڑتی تو ان سے سوال سمجھتا تھا۔ ویسے مجھے لگتا ہے کہ ناصر کو کم ہی ضرورت پڑتی ہو گی۔ مجھے اس چیز کی کرید کچھ کم ہی ہوتی تھی کہ کون کتنا پڑھا ہوا ہے۔ مجھے تو یہی فکر لگی رہتی تھی کہ میں شاید نہ پڑھ پاؤں۔ مجھے کچھ یوں پتا چلا کہ کسی نے ایک حساب کا سوال پوچھا اور وہ میں نے کر دیا عام حساب ہی کے طریقے سے۔

بعد کو پتا چلا کہ وہ تو بہت ہی مشکل سوال تھا، ناصر کے ابا نے بھی اس کو الجبرا کے طریقے سے کیا تھا، اور کہ وہ تو بی ایس سی ہیں۔

تایا یوسف کی حساب دانی سے زیادہ مجھے ان کے قرآن کریم کے ساتھ شغف نے متاثر کیا۔ ان کی بیٹھک میں، ہر طرف قرآن ہی قرآن نظر آتے تھے۔ چونکہ قرآن ہی تھے میں نے ان کو کھول کر پڑھنے کے لیے کبھی اجازت نہ مانگی، اور نہ ہی مجھے کسی نے ٹوکا۔ اکثر حاشیوں میں تفسیری نوٹ بھی لکھے ہوتے تھے۔ جب ابّا مرحوم کے ساتھ رہتے تھے ہم لوگ تو بلند آواز کے ساتھ قرآن مع ترجمے کے پڑھا

کرتے تھے۔ اماں ناظرہ ہی پڑھتی تھیں پر ہمیں یہ پتا تھا کہ قرآن کی آیات کے معنی ہوتے ہیں، لیکن اس بات کی سمجھ تایا یوسف کے قرآنوں کے حاشیے پڑھ کر آئی کہ بعض آیات کے معانی اور طرح بھی کیے جاسکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ تایا یوسف کو عربی خوب آتی تھی۔ کچھ تو یقین ہے کہ انہوں نے پڑھی ہو گی اور کچھ اس لئے بھی کہ ایک عرب ملک میں عمر کا ایک بڑا حصہ گذار کر آئے تھے۔ میں نے انکو عربی بولتے تو نہ سنا، کہ ایسا کوئی موقعہ نہ نکلا لیکن نمازوں میں انکی قرآت سے کچھ اندازہ ہو جاتا تھا کہ جو پڑھ رہے ہیں جانتے ہیں۔ فجر کی نماز میں تو اکثر سماں بندھ جاتا تھا، بغیر جانے کہ کیا پڑھ رہے ہیں دل اثر پذیر ہو تا تھا۔

گو کہ گھر میں نماز قرآن کا چرچا رہتا تھا لیکن میں نے باوجود سولہ سترہ سال کے ہونیکے قرآن مکمل طور پر نہیں پڑھا تھا۔ وجہ اس کی کچھ تو یہ تھی کہ گھر پہ پڑھتا تو اماں پڑھاتیں اور اماں کو حلق سے حلوے والی ح نکالنی نہیں آتی تھی اور کسی مسجد وغیرہ میں پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو تا تھا کہ بچپن زیادہ تر سفروں میں کٹا۔ پہلا اور آخری سپارہ پڑھ رکھا تھا اور پانچ سات چھوٹی سورتیں بھی یاد کر رکھی تھیں جب کبھی مذہب کا جوش اٹھتا نماز وغیرہ پڑھ کر وہیں سے کچھ پڑھ لیا کر تا تھا۔

تایا یوسف کے قرب کا اور انکے پیچھے نمازیں پڑھنے کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ مجھے بھی قرآن پڑھنے اور اسے مکمل طور پر پڑھنے کا شوق ہوا۔ اور ایک رمضان میں میں نے پورا قرآن پڑھ ہی لیا۔ آپس کی بات ہے، اگر صرف تایا یوسف کی بات ہوتی تو شاید میں انکو بھی ٹال جاتا آخر اتنا عرصہ ابا کو بھی تو ٹالا تھا۔ بات کوئی خاص تو نہیں پر اس وقت تھی۔ میرے ایک تایازاد تھے جو کہ مجھ سے دو تین سال چھوٹے تھے پر یہی ایک کمی تھی ان میں۔ ورنہ وہ ہر بات میں مجھ سے آگے تھے۔ میں چھ جماعت پاس کر کے ڈنڈے بجایا کر تا تھا اور وہ آٹھویں یا نویں میں تھے۔ مجھے بس ایک دو پاروں سے زیادہ قرآن نہیں آتا تھا اور انہوں نے بچپن ہی سے قرآن ختم کر رکھا تھا اور ہر رمضان میں پورا قرآن ختم کرتے تھے اس پر مستزاد یہ کہ بہت ہی خوش الحان تھے۔ روزانہ فجر کے بعد بھی پڑھتے تھے پر اس کا مجھ پر اثر کم ہی ہو تا تھا کہ میں اکثر فجر کے بعد لمبی تان لیتا تھا یا پھر دیر سے اٹھ کر پڑھتا تھا اور امی کی ویلے دی نماز تے کویلے دیاں ٹکراں (وقت کی نماز اور ناوقت کی ٹکریں) جیسی جلی کٹی سنتا تھا۔

خیر کچھ عرصہ تو میں نے برداشت کیا پر ایک رمضان میں بس یہ سمجھ لیں کہ پانی سر سے گزر گیا۔ وہ شاید کالج میں تھے اور میں بھی خیر سے دوبارہ اسکول جانے لگا تھا۔ بیسواں روزہ اور اماں نے ان سے پوچھا کہ وہ کون سے پارے پر ہیں۔ انہوں نے بائیسواں یا تئیسواں بتایا۔ اور اماں نے بڑی حسرت سے میری طرف دیکھا۔ بس سمجھ لیں کہ وہ ایک نظر کھا گئی مجھ کو۔ ظہر کا وقت تھا، شپاشپ وضو کیا اور نماز پڑھی، بلکہ ٹھونکی، اور بیٹھ گیا قرآن کھول کر۔ پہلا اور آخری پارہ پڑھنے کی وجہ سے کچھ حرف شناسی تو تھی اور کچھ تاو بھی تھا پانچ پارے پڑھ کر اٹھا۔ الغرض میں نے وہ رمضان ختم ہونے تک قرآن پڑھ لیا، جیسا بھی پڑھا۔ بیگم کا خیال ہے کہ غلط ہی پڑھا ہو گا۔ اب درست غلط کا تو مجھے پتا نہیں پر یہ ضرور پتا ہے کہ قاف پر اور صاد پر مجھے خاصی محنت کرنا پڑی، بعد کو۔ اور سچی بات یہ ہے کہ آج بھی جب کسی قاری کو سنتا ہوں تو بہت غور سے سنتا ہوں تاکہ کوئی نئی بات ہو تو اسے پلے باندھ لوں۔

خیر تو بات ہو رہی تھی کہ تایا یوسف اور عزیز عبد السمیع کی وجہ سے میں نے قرآن پورا پڑھا۔ اللہ تعالی ان دونوں کو غریق رحمت کرے۔ اور تایا یوسف کا مجھ پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ ان کا قرآن کریم کے ساتھ شغف اور اس کی تفسیر کے ساتھ دلچسپی نے بعد کو میری تعلیم میں بہت مدد دی۔ تایا یوسف کا ایک اور احسان بھی ہے مجھ پر کہ جب میں نے دوبارہ اسکول میں داخلہ لینا چاہا تو باوجود اس کے کہ انکا میرا کوئی رشتہ نہیں تھا اور میرے اپنے میرے اسکول میں داخلے کے مخالف تھے یہ میرے ساتھ گئے تھے مجھے ہائی اسکول مس داخل کروانے۔ اور سب سے بڑھ کر جس بات نے میرے کردار کی تشکیل کی سوچتا ہوں ہوں کہ وہ بھی کہ دوں کہ شاید، جس طرح وہ بات میرے کام آئی کسی اور کے بھی کام آجائے۔

تایا جی (تایا یوسف) کی دور کی نظر بے حد کمزور تھی، یہ موٹے موٹے شیشے ہوتے تھے انکی عینک کے۔ انکو دیکھ کر خیال یہی ہو تا تھا کہ کیا نظر آتا ہو گا بے چارے کو، پر انکی نظر گرد و پیش پر خوب رہتی تھی، اپنی تیز رفتاری کے باوجود۔ ایک روز میں جو گھر سے نکلا اور انکے گھر کے دروازے سے ذرا ہی آگے گیا ہو نگا کہ وہ گلی کا موڑ مڑ کر اپنے گھر کی طرف آتے نظر آئے۔ انکے قریب آنے پر میں نے سلام کیا تو جواب دیتے ہوئے رک گئے اور قریب قریب ایسے انداز میں جیسے کہ کوئی ضروری پیغام دینا ہو کہنے لگے بابا فرید کا ایک شعر ہے۔

کُوک فریدا کُوک جویں راکھا جوار
جب لگ ٹانڈانہ گرے تب لگ کُوک پکار

(اے فرید جوار کے رکھوالے کی طرح شور مچا اور جب تک فصل نہ کٹ جائے شور مچا تارہ) یہ کہ کر وہ اپنے گھر کو چل دیے اور میں اپنی راہ لگا۔

میری ایک عادت ہے. اسے میں جگالی کرنا کہتا ہوں، وہ یہ کہ جب فراغت ہو تو

باقی صفحہ ۲۸ پر

افسانہ

پکڑ

وحید احمد قمر (لندن۔انگلستان)

آسمان گہرے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ابھی اکتوبر کا آغاز ہی تھا مگر کچھ روز پہلے ہوئی بارش کی وجہ سے موسم دسمبر کی طرح سرد ہو گیا تھا۔ دور کسی مسجد میں فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ ہر طرف مہیب تاریکی تھی۔ ایسے میں دو موٹر سائکلوں کی ہیڈ لائٹس اس تاریکی کا سینہ چیرتی آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ سڑک دور تک سنسان پڑی تھی۔ پھر بھی ان موٹر سائکلوں کی رفتار زیادہ نہ تھی۔ شاید ہڈیوں میں گھستی سرد ہوا کی وجہ سے موٹر سائکل سوار آہستہ چل رہے تھے یا حقیقتاً انہیں کہیں پہنچنے کی جلدی نہ تھی۔ دونوں موٹر سائکل دس منٹ مزید اس سڑک پر چلتی رہیں پھر ایک بستی میں داخل ہوئیں اور مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی ایک چوراہے پر آکر رک گئیں۔

"دائیں طرف ہی مڑنا ہے نا؟" موٹر سائکل سوار نے اپنے پیچھے بیٹھے آدمی سے پوچھا۔

"جی"، مختصر جواب ملا، اور وہ موٹر سائکل اس گلی میں مڑ گئی۔ دوسری موٹر سائکل بھی اس کے پیچھے لپکی اس پر بھی دو ہی آدمی سوار تھے۔ چاروں نے سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ یہاں موٹر سائکلوں کی ہیڈ لائٹس بجھا دی گئیں۔ اس گلی میں دونوں طرف مکانات کا سلسلہ تھا مگر کہیں بھی روشنی نہ جل رہی تھی اس لیے تاریکی ابھی تک ماحول پر مسلط تھی۔ ایسے میں وہ دونوں موٹر سائکلیں بھی اس تاریکی کا حصہ ہی معلوم ہو رہی تھیں۔ کچھ دور جا کر وہ پھر رک گئے۔

"یہ عمارت کا پچھواڑا ہے۔" اگلی موٹر سائکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے شخص نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "وہ سامنے ایک چھوٹا دروازہ ہے ہم یہاں سے اندر جائیں گے۔"

"رحیم آؤ؟" آخری جملہ اس نے دوسری موٹر سائکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے نوجوان کو مخاطب کر کے کہا۔ اور دراوزے کی طرف بڑھا۔ رحیم بھی اس کے پیچھے لپکا۔ پہلا کچھ دیر تک دروازے سے کان لگائے سن گن لیتا رہا پھر اندر داخل ہو گیا رحیم نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

وہ ایک وسیع صحن میں تھے سامنے ایک چھوٹی سی چوکور عمارت تھی جس کے صحن کی طرف تین دروازے تھے۔

"تم ان دروازوں میں سے کسی ایک سے اندر جاؤ گے جب کہ میں بغلی گلی کی طرف سے کھڑکی تک جاؤنگا۔" پہلے نے جیکٹ کی سامنے والی زپ کھولی اور اندر چھپائی گن اپنے ہاتھ میں لے لی رحیم نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

"تمھارے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں،" پہلے نے رحیم کو گھورا

"نن نہیں تو،" رحیم نے بے اختیار اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ہاتھ واقعی کانپ رہے تھے۔

"سس سردی کی وجہ سے" رحیم کے منہ سے نکلا، اس کی آواز میں بھی کپکپاہٹ تھی۔

"پتہ نہیں اس آپریشن کے لیے تمھارا انتخاب کیوں کیا گیا، مجھے تو تم شروع سے ہی گھبرائے ہوئے لگے ہو۔"

"میں گھبرایا ہوا نہیں ہوں، محض سردی کی وجہ سے ۔۔۔۔" رحیم نے کچھ کہنا چاہا مگر پہلے نے اس کی بات کاٹ دی بزدلی کی باتیں نہ کرو۔ اس نے گھڑی پر وقت دیکھا اور بولا

"آؤ میرے ساتھ" وہ صحن سے گزرتے ہوئے عمارت تک پہنچے، رحیم ایک دروازے کی طرف بڑھا جبکہ دوسرا شخص اس تنگ سی گلی میں داخل ہو گیا۔ جو عمارت اور اس بیرونی دیوار کو جدا کرتی تھی۔ اس گلی میں عمارت کی کھڑکیاں تھیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ کھڑکیاں بند تھیں اس نے ایک جھری سے اندر جھانکا، چند لمحوں تک حالات کا جائزہ لیتا رہا پھر پیچھے ہٹ آیا اگلے ہی لمحے اس نے کھڑکی پر بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی۔ لکڑی کی کھڑکی میں کئی سوراخ ہو گئے۔ اس نے گن کی پشت سے ان سوراخوں پر زور کی ٹھوکر رسید کی۔ کھڑکی میں ایک بڑا سوراخ ہو گیا ایک لمحہ ضائع

کیے بغیر اس نے پھر فائرنگ شروع کر دی۔ اندر سے قیامت کا شور اٹھا۔ آہ و بکا، چیخ و پکار اس نے لوگوں کے جسموں سے خون کے فوارے چھوٹتے ہوئے دیکھے۔ اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے واپسی کے لیے پلٹا جب وہ صحن میں پہنچا تو رحیم بیرونی دروازے کی طرف بھاگتا ہوا نظر آیا۔ باہر موٹر سائکل اسٹارٹ کیے ان کے دونوں ساتھی تیار کھڑے تھے، وہ دونوں، ان کے پیچھے بیٹھ گئے اور موٹر سائکلیں تیر کی طرح نکلتی چلی گئیں۔

وہ سارا دن ان کے لیے بڑا ہنگامہ خیز گزرا۔ جب وہ اس آپریشن کے بعد اپنے ٹھکانے پر پہنچے تو ان کے گروپ انچارج نے ان کے لیے ایک طویل سفر کا بندوبست کر رکھا تھا۔ انہیں فوری طور پر یہ علاقہ چھوڑ کر ملک کے ایک شمالی شہر پہنچنا تھا اور اس وقت تک وہاں قیام کرنا تھا جب تک یہ معاملہ کچھ پرانا ہو جاتا۔

وین کے ایک طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد جب وہ شمالی ریاست کے شہر میں داخل ہوئے تو انہیں کسی قدر تحفظ کا احساس ہوا۔ ورنہ تمام راستے انہیں پولیس سے مڈ بھیڑ کا خطرہ رہا تھا۔ جب وہ اس ٹھکانے پر پہنچے جہاں انہیں کچھ عرصہ قیام کرنا تھا تو رات ہو چکی تھی۔ ان میں سے تین تو لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے جب کے چوتھا اپنے بستر پر لیٹا چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ یہ رحیم تھا نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ ابھی تک صبح کے واقعے کی ہولناکیوں میں کھویا ہوا تھا بلکہ سارے سفر کے دوران ایک لمحے کو بھی وہ اس منظر کو فراموش نہ کر پایا تھا جب اس کے سامنے انسانی جسم خون میں نہائے گئے تھے۔ وہ آہ و بکا، چیخ و پکار اور خون میں لتھڑا ہوا منظر۔ اس کی آنکھوں میں ٹھہر گیا تھا۔ راستے میں اس کے ساتھی خوش گپیوں میں مصروف رہے تھے مگر وہ گم صم پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا تھا، حتّٰی کے کھانے کے لیے جب اس کے ساتھیوں نے بلایا تو بھی اس نے معذرت کر لی۔

وہ دیر تک بستر پر پڑا چھت کو تکتا رہا۔ حلق خشک ہو رہا تھا، وہ اٹھ کر کچن میں آیا۔ پانی پینے کے بعد وہ بالکونی میں جا کھڑا ہوا۔ رات کافی بھیگ چکی تھی۔ اس نے دیکھا دور تک چھوٹی بڑی عمارتیں اندھیرے میں ڈوبی کھڑی تھیں۔ آسمان آج بھی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اس وجہ سے بھی رات کچھ زیادہ ہی تاریک معلوم ہو رہی تھی۔

اسے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا اس کا ایک ساتھی چلا آ رہا تھا، اس نے قریب آ کر کہا:

''کیوں؟ نیند نہیں آ رہی۔؟''

''نہیں''، وہ تاریکی کو گھورتا رہا

''میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم صبح کے واقعہ کے بعد بہت خائف ہو۔''

رحیم خاموش رہا۔

''کیا تم شرمندگی محسوس کر رہے ہو؟''

''شرمندگی۔۔۔۔۔'' رحیم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا، ''مجھے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہو رہی ہے''

''تم اگر اتنے نرم دل ہو تو تمھیں ہمارے ساتھ نہیں جانا چاہیے تھا۔''

''مجھ سے کہا گیا تھا کہ کچھ لوگ اس جگہ جمع ہو کر ہمارے خلاف مسلح کاروائی کی سازش تیار کر رہے ہیں۔ مگر حقیقت اس کے برعکس نکلی۔''

''بہر حال وہ لوگ ہیں تو ہمارے دشمن۔''

''کیا نہتے دشمن پر گولیاں برسانا بہادری ہے؟''

''وہ کافر ہیں، تمہیں ان کے ساتھ ہمدردی نہ ہونی چاہیے۔''

''کیا ہر کافر واجب القتل ہوتا ہے۔؟''

''جس کا کفر جتنا سنگین ہو گا وہ اتنا ہی سزا کا حق دار ہو گا۔''

''سلیم، بہت سے لوگ ہمیں بھی کافر سمجھتے ہیں۔ اگر وہ بھی اسی اصول پر عمل کریں کہ کافر موجب سزا ہے تو پھر یہ دنیا ایک عظیم فساد گاہ بن جائے گی۔''

''اگر تم تنظیم سے متفق نہیں ہو تو پھر ہم میں شامل کیوں ہوئے تھے۔''

''بتاتا ہوں، آج سے قریباً ایک سال پہلے ایک مذہبی جلسے میں بم دھماکہ ہوا تھا جس میں درجنوں لوگ شہید ہو گئے تھے۔ تمھیں یاد ہو گا؟''

''ہاں، مجھے یہ واقعہ کیسے بھول سکتا ہے، سب ہمارے ہی لوگ تھے۔'' سلیم نے کہا

''مرنے والوں میں میرے تین بڑے بھائی اور والد صاحب بھی شامل تھے۔''

رحیم کی آواز درد سے بھر گئی

''نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔'' سلیم کی ہلکی سی چیخ نکل گئی

''جب ایک ہی وقت گھر سے تین جوان بیٹوں اور خاوند کا جنازہ اٹھا تو میری والدہ کو ہارٹ اٹیک ہو گیا اور محلے والوں کو پانچویں جنازے کا بھی بندوبست کرنا پڑا۔''

رحیم کی آواز رندھ گئی تھی۔

سلیم اسے دیکھے جا رہا تھا

''تم تصور کر سکتے ہو کہ اس وقت میری کیا حالت ہوئی ہو گی؟''

سلیم سر ہلا کر رہ گیا۔

"مجھے ہفتوں اپنی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ کھانے پینے کا ہوش نہ پہنچنے کا۔ پاس پڑوس والے کبھی کبھار خبر گیری کر جاتے۔ صدمے کی اس اتھاہ گہرائی کی حالت میں مجھے منصور صاحب ملے۔ انہوں نے مجھے تسلی تشفی دی اور مخالف فرقے کے خلاف بہت سا لٹریچر پڑھنے کو دیا۔ میرے دل میں تو پہلے ہی آگ لگی ہوئی تھی۔ منصور صاحب کی باتوں نے اسے دوچند کر دیا۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ میرے والد صاحب کے قاتل فلاں فلاں لوگ ہیں، تب میں باقاعدہ تنظیم میں شامل ہوا۔ تا کہ ان سے بدلہ لے سکوں۔ پھر کئی ماہ تک میری ٹریننگ ہوتی رہی، آخر کل منصور صاحب نے مجھے خاص طور پر بلا کر کہا کہ تمھارا انتقام لینے کا وقت آ چکا ہے۔ تیار ہو جاؤ۔"

"اور تم تیار ہو گئے۔"

"ہاں میرے سینے میں انتقام کی آگ سلگ رہی تھی۔ میں بڑے جوش اور ولولے سے اس کاروائی میں حصہ لینے گیا تھا۔ صلاح الدین نے مجھے سامنے کے دروازے سے اندر جانے کے لیے کہا، خود وہ بغلی گلی سے فائرنگ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا سامنے نظر آنیوالے ہر شخص کو گولیوں سے بھون ڈالنا۔"

"اور تم نے بھون ڈالا؟"

"نہیں، میں ان لوگوں پر فائر نہ کر سکا۔"

"سلیم نے بے یقینی سے اسے دیکھ کر کہا۔ مگر ہم نے تو گنوں کے چلنے کی آواز سنی تھی۔"

"جب میں اندر داخل ہوا تو فائرنگ کرنے ہی والا تھا کہ اندر کا منظر دیکھ کر گن خود بخود جھک گئی۔" رحیم کہتے کہتے رک گیا۔ کچھ دیر باہر پھیلی تاریکی کو گھورتا رہا پھر بولا

"وہ لوگ نماز کے لیئے صفیں بنائے کھڑے تھے، اور سب سے پچھلی صف میں زیادہ تر بچے تھے۔ آٹھ سے بارہ سال تک کی عمر کے بچے۔ اگر میں فائرنگ کرتا تو سب سے پہلے یہ بچے ہی میری زد میں آتے۔۔۔ سلیم ۔۔۔ گن میرے ہاتھ میں منوں وزنی ہو گئی۔ اسکی نالی کا رخ فرش کی طرف تھا اور میری فائرنگ سے فرش اکھڑتا رہا۔ دوسری طرف صلاح الدین نے کھڑکی سے فائرنگ شروع کر دی تھی۔ میرے سامنے صفیں باندھے، عبادت کرتے لوگ خون میں نہاتے چلے گئے۔" رحیم دم لینے کے لیے رکا۔

"صرف صلاح الدین کی فائرنگ سے تو زیادہ لوگ نہ مرے ہونگے۔ کیونکہ وہ کھڑکی سے ہال کے کچھ مخصوص حصہ پر ہی فائرنگ کر سکتا تھا۔" سلیم نے خیال ظاہر کیا۔

" ایسا ہی ہوا ہے۔ اس وقت ہال آدھے سے زیادہ بھرا ہوا تھا، اگر میں بھی فائرنگ کرتا تو شاید ہی کوئی زندہ بچتا۔"

"تم نے یہ بات مجھے تو بتا دی ہے۔ صلاح الدین یا منصور سے اس کا ذکر بھی نہ کرنا۔" سلیم نے ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

"یہ بات چھپی نہ رہ سکے گی۔ نہیں۔۔۔ میں انہیں صاف صاف بتا دونگا۔ کہ ان لوگوں کو نماز پڑھتا دیکھ کر میں ان پر فائرنگ نہ کر سکا۔ بلکہ ان پر یہ بھی واضح کر دونگا کہ میں آئندہ ایسی کسی کاروائی میں حصہ نہیں لونگا۔"

"بھول کر بھی تنظیم سے الگ ہونے کی بات ان کے سامنے نہ کرنا۔"

"کیوں؟"

"وہ تمھیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"مجھے ان لوگوں کا خوف نہیں ہے۔"

"پھر تمھیں کس بات کا خوف ہے۔"

"اللہ کی پکڑ کا۔ ایک عبادت گاہ میں خدا کی پرستش کرنے والوں کو خون میں نہلایا گیا ہے، کیا خدا خاموش رہے گا۔ مجھے آسمان پر چھائی اس ہولناک تاریکی سے ڈر لگ رہا ہے۔۔۔ کچھ ہونے والا ہے کچھ ہو کر رہے گا۔" رحیم کی آواز لرز رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہو گا، ایسے کتنے ہی واقعات ہو چکے ہیں مگر نہ آسمان گرا نہ زمین ہی پھٹی۔"

"یہی تو خوف کی بات ہے کہ اب ظلم کی انتہا ہو چکی ہے۔ زمین پر بہت خون ناحق بہہ چکا، آسمان آخر کب تک خاموش رہے گا۔"

"تم اپنے دماغ پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو، چلو میرے ساتھ اندر۔" سلیم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "تمھیں آرام کی ضرورت ہے، ہ ایک بار پھر کہتا ہوں کہ اپنے ان خیالات کا اظہار کسی پر نہ کرنا۔"

اگلی صبح ناشتے کے بعد جب صلاح الدین نے اخبار میں یہ پڑھا کہ کل والے فائرنگ کے واقعہ میں صرف آٹھ لوگ مارے گئے تھے تو آگ بگولا ہو گیا۔ اور رحیم کو مخاطب کر کے کہا۔

"تمھیں میں نے اسی لیے ہال کے دروازے سے بھیجا تھا کہ تم نئے آدمی ہو۔ ٹارگٹ کو نشانہ بناتے وقت تمھیں کوئی دشواری نہ ہو۔ مگر شاید تم نشانے پر فائر نہیں

کر سکے۔"

رحیم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیوں؟؟"۔۔۔اس کے لہجے میں سختی آگئی۔

رحیم نے کوئی جواب نہیں دیا وہ گم صم بیٹھا میز کے کونے کو تکے جا رہا تھا۔

"شاید گھبراہٹ میں نشانے پر فائرنگ نہ کر سکا۔" سلیم درمیان میں بول پڑا۔

"میں نے منصور سے پہلے ہی کہا تھا کہ اس آپریشن کے لیے یہ لڑکا موزوں نہیں ہے۔" صلاح الدین کی آواز ابھی تک درشت تھی۔

"ابھی نیا ہے، آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائیگا۔" سلیم نے کہا

"اور یہ کل سے اتنا سہا ہوا کیوں ہے؟"

"اسے پکڑے جانے کا ڈر ہے۔" سلیم کے منہ سے نکلا

"ہاہاہا"، صلاح الدین نے ایک طویل قہقہہ لگایا۔ پھر رعونت سے بولا۔

"ہمیں کون پکڑ سکتا ہے۔"

"سلیم، اسے کچھ دیر کے لیے یہاں سے لے جاؤ، مجھے رہ رہ کر اس پر غصہ آرہا ہے۔"

سلیم نے رحیم کا ہاتھ پکڑا اور اسے راہداری میں لے آیا۔

"تم کچھ دیر کے لیے باہر چلے جاؤ۔ تھوڑی دیر میں صلاح الدین کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ پھر آجانا۔ ابھی جاؤ۔"

رحیم چپ چاپ بیرونی دروازے کی طرف مڑ گیا، یہ ایک فلیٹ تھا جو ایک پانچ منزلہ عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے سڑک پر آگیا۔ سڑک کی دوسری طرف ایک وسیع میدان تھا جس کے بعد پہاڑوں کا ایک سلسلہ تھا جو دور تک چلا گیا تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا میدان عبور کرنے لگا۔ عین اسی وقت بڑے زور کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ زمین ہلنے لگی تھی۔ رحیم کی نگاہ سامنے کی عمارتوں کی طرف اٹھ گئی جو بڑے مہیب دھماکوں کے ساتھ زمین بوس ہو رہی تھیں جبکہ میدان کی دوسری جانب واقع پہاڑوں سے بڑے بڑے پتھر لڑھکتے ہوئے نیچے آرہے تھے۔ رحیم نے بھاگنا چاہا مگر زمین کی جنبش کچھ اور بڑھ گئی اور وہ منہ کے بل نیچے گرا۔ اس کے حواس جواب دیتے جارہے تھے۔ غنیمت ہوئی کہ جہاں وہ گرا تھا وہ جگہ گرتی ہوئی عمارتوں کے ملبے اور پہاڑوں سے لڑھک کر آنے والے پتھروں سے محفوظ تھی۔

(بشکریہ ماہنامہ اُردو آپریشن۔ جھارکنڈ۔ نومبر ۲۰۱۳ء)

غزل

طفیل عامر
لنڈن، انگلستان

قریب آتے ہیں اپنے پرے بھی جاتے ہیں
انہیں معلوم نہیں ہم مرے بھی جاتے ہیں

ہمارا کام ہے در پہ صدائیں دینے کا
اگرچہ کاسے ہیں لیکن بھرے بھی جاتے ہیں

جو ہو طوفان تو پھر کس کی خیر ہو ممکن
کہ سوکھے ہی نہیں پتے ہرے بھی جاتے ہیں

وہ کس کے پاؤں تھے میں سوچتا رہا پہروں
وہ کیا زمین ہے جس پر دھرے بھی جاتے ہیں

کمال صحبتوں کا ہم نے دیکھا ہے عامرؔ
نہیں ہے کھوٹوں کا قصّہ کھرے بھی جاتے ہیں

غزلِ خطاطی۔۔ صابر ظفؔر کی تخلیقات کا جہانِ نَو

ابن کلیم احسن نظامی

اس جہانِ رنگ و بو میں حسنِ فطرت جا بجا بکھرا ہوا ہے۔ اس کو جانچنے اور بھانپنے کے لیے اور اس سے حظ اُٹھانے کے لیے جمالیاتی نظر شرط ہے۔ وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے:

آنکھ والا تیرے جوبن کا تماشا دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

تخلیق کاروں کے نزدیک غزل کہنے کے لیے کسی محبوب کا ہونا لازمی ہے۔ چاہے وہ خیالی ہی کیوں نہ ہو حالانکہ جس طرح فطرت کے حسین نظارے موضوعِ سخن بن جایا کرتے ہیں اسی طرح فنونِ بصری میں فنِ خطاطی بھی بڑا وسیع کینوس کا حامل ہے جنابِ صابر ظفر نے اپنے باکمال جذبۂ تخلیق کے اظہار کے لیے خطاطی کو محبوب کا درجہ دے کر اس پر طبع آزمائی کی اور اپنے مجموعۂ کلام "غزلِ خطاطی" میں 70 غزلیں رقم کر دیں۔ یہ انہیں کا ہی کمال ہو سکتا ہے۔ انہوں نے تخلیق کاروں کو ایک نیا کینوس دے دیا ہے، اب ان کی تقلید میں کئی شعراءِ کرام خطاطی کی جانب متوجہ ہوں گے اور طبع آزمائی کی جائے گی۔

قلم کی طاقت مسلّم ہے اور حق سچ رقم کرنے والا قلم کار اس کی عظمت کو سلام عقیدت پیش کرتا ہے اور جھوٹ کا سہارا لے کر لکھنے والا خائن ہے۔ ایسے خائن کے خبث باطن کو کیسے ابلاغ کے ساتھ اُجاگر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

زندگی جس نے گذاری ہو سدا جھوٹ کے ساتھ
حرفِ حق لکھا جو دیکھے تو برا لگتا ہے

کم و بیش چودہ سو برس سے ہمارے ارتقائی روایتی فن خطاطی کو جو کہ بلا مبالغہ ہماری ثقافتی میراث ہے اس کو موضوع بنا کر آج تک اکثر شعرائے کرام نے زیادہ سے زیادہ ایک نظم بمشکل لکھی، مگر ہماری حیرت کی انتہا ہو گئی جب جناب صابر ظفر کی کتاب غزلِ خطاطی نظر نواز ہوئی۔ انہوں نے ایک تاریخی کارنامہ کر دکھلایا ہے۔ انہوں نے اپنے روحانی وجدان اور علمی تصرّف کو بروئے کار لاتے ہوئے پورا

دیوان اس ایک موضوع پر رقم کر دیا ہے۔ 70 غزلوں میں سے ہر غزل کا محور و منبع ارکانِ خطاطی ہیں۔ انہوں نے الف سے لے کر 'ی' تک ہر حرف کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ نہ صرف خطاطی کی پوری تاریخ اشعار میں سمو دی ہے بلکہ زبر زیر پیش شد، مد، جزم جیسے سبھی اعراب اور نقطہ سے لے کر نشست و کرسی کی تمام علامتیں اشعار میں بڑے کمالِ فن سے رقم کر دی ہیں۔ ان کی ایک غزل کا مطلع ہے جس میں خطاطی پر ایک معروف فارسی شعر کے دوسرے مصرعے ''می نویس و می نویس و می نویس'' کی شباہت ملتی ہے۔

اپنے پرکھوں کی روایت کا اثر آئے گا

لکھتے لکھتے ہی تو لکھنے کا ہنر آئے گا

جناب صابر ظفر نے خط کی تاریخ کو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر بالترتیب اپنے ان اشعار میں یوں قلمبند کیا ہے۔

وہی ہیں حضرتِ آدمؑ کی اولیں الواح

نقوش جن کے ملے زیرِ خاک اینٹوں سے

لکھی گئیں جو تکونے قلم سے تحریریں

وہ مستعار ہیں بابل کے رہنے والوں سے

اگرچہ حضرتِ ادریسؑ موجدِ خط تھے

مگر ''قبیلۂ طے'' کا بھی اس میں حصّہ لکھ

وہ سارے کتبے جو کوہِ بے ستوں سے ملے

ظفرؔ انہیں ''خطِ میخی'' کا ہی نمونہ لکھ

صابر ظفرؔ خطاطی کے فن سے اپنی والہانہ اُلفت اور رغبت کا اِظہار کرتے ہوئے اس شعر میں خطاطی کی عظمت کا اعتراف اور نیک تمنا کا اِظہار بھی کر رہے ہیں کہ خطاطی کو کبھی زوال نہیں چاہے کمپیوٹر کیلی گرافی فنِ خطاطی پر غالب آنے کے عمل میں ہے۔ کہتے ہیں:

روحِ اسلام کا یہ پوری طرح ہے عکاس

فنِ خطاطی اسی واسطے ہے اثباتی

زمانۂ قدیم میں کسی بڑے پرندے کے پر کو اوزاری ذریعہ بنا کر لکھائی کی جاتی رہی، اس متروک قدامت کو صابر ظفرؔ صاحب نے شعر میں کس طرح زندہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

پر سے لکھتا ہوں کہ اب یہ ہی قلم ہے میرا

لفظ طائر کی طرح اُڑتا ہوا لگتا ہے

یہاں اُڑتے ہوئے کی اصطلاح کو کس حسنِ بیان کے ساتھ رقم کیا ہے۔ پھر ملاحظہ کیجیے کہ جب خلافتِ عباسیہ کے دور میں عظیم تخلیق کار خطاط ابنِ مقلہ بیضاوی جنہوں نے بنیادی چھ طرز ہائے خطاطی زمانے کو ایسے مرصع ایسے مکمل دیں کہ آج تک ان میں سے اکثر مروّج و مقبول خط چلے آرہے ہیں۔ ساتویں صدی ہجری میں اسی ابنِ مقلہ کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ گویا انہیں سیاسی چپقلش اور ظلم کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ اس واقعۂ فاجعہ کو کس حسنِ ادا سے قلمبند کر کے تاریخِ غزل میں اَمر کر دیا گیا ہے۔ اور اس پر اپنا دکھ بھی ظاہر کیا گیا ہے۔

دستِ خطاط قلم ہونے پہ روتا ہوں ظفرؔ

کتنے ظالم ہیں جنہیں ظلم روا لگتا ہے

اگلی غزل سے ایک اور شعر اسی حوالہ سے یوں لکھتے ہیں:

ہاتھ کٹنے پہ بھی اے نوکِ قلم

ابنِ مقلہ نے قیامت لکھا

روایت ہے کہ ہاتھ کٹ جانے کے بعد بازو سے قلم باندھ کر بھی ابنِ مقلہ بڑا کمال لکھتے تھے۔

آج جس طرح لوگ خطاطی کے جوبن سے بے بہرہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے بڑوں کو معلوم تھا کہ خطاطی سیکھنے والے قطوں کے راز سے کس طرح واقفیت حاصل کرتے ہیں اور کس طرح ان کی خفتہ صلاحیتیں اُجاگر ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے وہ اپنے بچوں کو خطاطی کی باقاعدہ تربیت کے لیے کسی دارالتحریر پر بھیجتے تھے تب ان کا قلم روانی سے چلتا تھا مگر اب کی پود کو تو سِرے سے لکھنا ہی نہیں آتا اسی درد کو محسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کاش تم آؤ کبھی جانب دارالتحریر

خوش خطی سیکھو قلم چلتا نظر آئے گا

ایک غزل کا مطلع اس حسنِ ادا سے رقم کرتے ہیں کہ ''نون'' کے دائرے اور مرکزی نقطے کو باکمال طریقے اور جمالیاتی اظہار سے موضوع بنایا ہے اور خوبصورت لکھائی کرنے والے خطاط کو سرچشمۂ محبت سے تشبیہ دی ہے۔ لکھتے ہیں:

کسی خطاطِ محبت کا لکھا لگتا ہے
نون کو دیکھوں تو آویزہ تراؔ لگتا ہے

''غزلِ خطاطی'' میں اتنی عظیم الشان غزلیں جو کہ ساری کی ساری خطاطی کی مربوط تاریخ کا بھی حوالہ ہیں بلکہ یوں کہیے کہ فنِ خطاطی کی مکمل منظوم تاریخ ہے۔ اور چالیس کے لگ بھگ ان کی تخلیقات شعری جو کہ نہایت منفرد ہیں تحریر کرنے کے باوجود جنابِ صابر ظفؔر کی انکساری کا عالم یہ ہے کہ ایک غزلِ خطاطی کے مقطع میں یوں گفتار کرتے نظر آتے ہیں۔

کچھ اور لکھنے کی نوبت پھر آتی کیسے ظفؔر
الف ہی لکھنا نہیں آیا ہم کو برسوں سے

جس طرح خواجہ غلام فرید کوٹ مٹھن والی سرکار نے فرمایا تھا: ''ہِک الف ہِکو ہم بس وے میاں جی'' یعنی ایک الف ہی بس میرے لئے کافی ہے اس کا بھید سمجھ آجائے تو بہت ہے۔

خطِ نستعلیق جو کہ جمالیاتِ خطاطی میں نہایت نفاست، نزاکت، نوک پلک، کششوں اور حسین بیضوی دائروں کا اور نشست و کرسی کا عظیم سنگم ہے۔ اس کی کیا ہی بات ہے۔ فی زمانہ مقبول و مروّج سات خطوط کوفی، رقعہ، دیوانی، نسخ، ثلث، تعلیق کا تتمّہ خطِ نستعلیق پر ہوتا ہے۔ یہ بھی اَمرِ واقعہ ہے کہ راقم (ابنِ کلیم) نے ایک نیا طرزِ تحریر ''خطِ رعنا'' کے نام سے ایجاد کیا ہے اور مذکورہ ساتوں خطوں (طرز ہائے تحریر) کی جمالیاتی جھلک اس میں موجود ہے۔ گویا ''نسخ اور تعلیق'' کا مرقع جس طرح نستعلیق ہے اسی طرح خطِ رعنا مروّجہ سارے خطوط کا مرقع بھی ہے اور اس میں جدّت طرازی بھی ہے۔ اور خطِ نستعلیق جو ساتویں صدی ہجری میں میر علی تبریزی نے تخلیق کیا اس کو جِلا بخشی اس کی جلوہ آرائی ایسی ہے کہ آنکھوں میں جذب ہو کر دِل میں سما جاتا ہے۔ مذکورہ مروّجہ سات خطوں کے علاوہ دیگر سینکڑوں خطوط قبل ازیں ماضی میں معرضِ وجود میں آئے تھے جو کسی نہ کسی جھول یا جمالیاتی ذوق کو کھٹکنے کے سبب متروک ہو چکے ہیں۔ مثلاً نستعلیق میں جلی لفظ کے اندر ابری بنادی اور اسے خطِ البری قرار دے دیا یہ لاعلمی ہے۔ اسے خطِ نستعلیق بہ نمونۂ ابری، یا نمونۂ ماہی وغیرہ کہا جائے گا۔

جنابِ صابر ظفؔر نے نستعلیق کی جمالیات کو اپنی روح میں اُتار لیا ہے اور کچھ اس طرح تعریف کرتے ہیں:

ہے مری روح کے نزدیک ''خطِ نستعلیق''
بعض خط مُردہ ہیں اور مُردوں کا شمشان ہے گُم

اگلے شعر میں اسی کی تشریح کے طور پر لکھتے ہیں جس میں خطِ نستعلیق کی چمک دمک کا اظہار اس طرح سے ہے:

بعض الفاظ جو بجھ جاتے ہیں مِٹ جاتے ہیں
بعض الفاظ چمکتے ہیں ستاروں کی طرح

زبر، زیر، پیش کو شعر میں پرونا بڑا مشکل امر ہے۔ اعراب کے حوالہ سے صابر ظفؔر نے کس حُسن و خوبی کے ساتھ ایک غزل کا یہ مطلع رقم کیا ہے۔

میں جو کھویا ہوا اعراب کے دفتر میں رہا
عمر بھر زیر، زبر، پیش کے چکر میں رہا

یہ الگ بات ہے کہ اب کمپیوٹر کیلی گرافی میں زیر، زبر، پیش کو مصلحتاً ترک کر دیا گیا ہے جس کی بناء پر بے شمار پڑھنے والے منظوم کلام درست پڑھ نہیں پاتے۔ کیونکہ اشعار میں جو حسن اور ابلاغ اور صحیح تلفظ بطورِ خاص زبر، زیر، پیش سے نمایاں ہوتا ہے وہ اب عنقا ہوتا جا رہا ہے۔ اسی غزل کے اگلے شعر میں فرماتے ہیں:

اس طرح جذب رہا جزم کی صورت پیہم
گردشوں میں بھی سدالفظ کے محور میں رہا

اسی غزل کے ایک شعر میں واوین کا تذکرہ کس انداز سے کرتے ہیں اور کس طرح پناہ تلاش کر رہے ہیں۔

مجھ کو دیتے رہے تحریر میں واوین پناہ
مدّو جزر آتے رہے پھر بھی میں ساگر میں رہا

جناب صابر ظفؔر کی ہر غزل میں ہر ہر شعر اِس قدر بصیرت افروز انداز میں خطاطی کے ساتھ وِجدانی طور پر منسلک ہے کہ اس کا اظہار اور بیان کرنے سے قلم قاصر ہے۔ وہ خطاطی کے متروک ہوتے جانے کا درد محسوس کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

کمپوز ہو رہے ہیں مضامین اب یہاں
لگنے لگے ہیں لوح و قلم خواب کی طرح

خطاطی کے اوزاری ذرائع قلم، قلم تراش، سیاہی، تختی، دوات، روشنائی، سُوف، سیاہی کی تروتازگی اور روانی، اقسامِ خطاطی غرض یہ کہ ان کا کوئی استعارہ خطاطی سے باہر کا نہیں۔ ''غزلِ خطاطی'' میں ہمارے نزدیک یہ غزل ہائے خطاطی ہے۔ دیکھئے

ایک شعر میں فرماتے ہیں:

سیاہی سوکھنے نہیں دیتا کوئی خطاط
اور ایک میں کہ مرے پاس ہے قلم نہ دوات

اور پھر اسی غزل کے اگلے شعر میں لکھتے ہیں:

قلم تراشا پہنچا تھا میں وہاں کہ لکھوں
کہاں گئے وہ کھلاڑی، بچھا سکیں جو بساط

صابر ظفؔر صاحب نے محبت کی کتاب لکھنے والے سے کس قدر وَالہانہ اپنائیت اور پیار کا اِظہار کیا ہے۔ اسی غزل کے مقطع میں یوں لکھتے ہیں:

نجانے کس نے لکھا پہلی بار پریم گرنتھ
پتہ چلے تو ظفر چوم لوں میں اِس کے ہاتھ

یقین جانیے کہ "غزل خطاطی" کا سارا مجموعہ صابر ظفؔر صاحب نے خونِ جگر سے رقم کیا ہے۔ خطاطی کے حوالہ سے اس قدر کامل معلومات کسی خطاط کو بھی شاید میّسر نہ ہوں جو پہلے انہوں نے حاصل کیں۔ اس اَمر کا اظہار وہ اپنے اِس شعر میں یوں کر رہے ہیں:

جو لفظ لکھتے ہوئے روشنائی سوکھتی ہے
میں ان کو اپنے لہو کی نمی سے لکھتا ہوں

اور کہیں وہ پورے اعتماد کے ساتھ اور اپنے فن کے اظہار کے لیے یقینِ کامل کے ساتھ پورے عزم سے یہ اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

زمینیں لفظوں کی زرخیز میرے واسطے ہیں
جہاں بھی چاہوں گا میں شاعری اُگا لوں گا

اور سوئے ہوئے (کھوئے ہوئے) لفظوں کو کس چابکدستی کے ساتھ بیدار کر دینے کا ہنر رکھتے ہیں:

اگر ملا نہ کوئی اور رتجگے کے لئے
میں سوئے لفظوں کو پوری طرح جگا لوں گا

جناب صابر ظفؔر نے غزلِ خطاطی کا تحفہ راقم کو اَرسال کیا جو 13 اپریل 2013ء کو ملا۔ مکمل مجموعہ ایک ہی نشست میں پڑھا تو سوائے یہ تبصرہ لکھنے کے کوئی اور کام اچھا نہیں لگا۔ کیونکہ بقول صابر ظفؔر:

دولتِ لوح و قلم میرے لئے کافی ہے
جمع کرتا ہوں جو رکھتا ہوں سبھی حرف پہ حرف

اور مجھے یقین ہے کہ اپنے ان الفاظ کو خالی فلک کی طرف نہیں اچھال رہا بلکہ جنابِ صابر ظفؔر کے حضور نذر کر رہا ہوں۔ جبکہ ان کا فرمان کچھ اس طرح سے ہے:

بھروں گا مٹھی میں الفاظ، جگنوؤں کی طرح
اور ان کو خالی فلک کی طرف اُچھالوں گا

۞

بقیہ: کوک فریدا کوک میں گزشتہ واقعات پر غور کرتا ہوں۔ اور پھر ان پر اپنی رائے قائم کرتا ہوں۔ تو اس واقعے کے بعد پہلی جگالی میں میں نے اس شعر پر غور کیا تو یہ معرفت کا شعر لگا کہ جوار کا راکھا بھلا کیوں شور مچائے گا؟ اسی لیے ناں کہ پنکھ پنکھیرو اور طوطے وغیرہ فصل پر نہ بیٹھیں اور کیوں نہ بیٹھیں؟ بیٹھیں گے تو جوار کھائیں گے فصل خراب ہوگی۔ پر یہ تو جوار کے راکھے کا کام ہے، باوا فرید کو کیا پڑی تھی کہ جوار کے راکھوں کا سبق ہم کو سنائیں۔ اس لئے اس شعر کو یونہی نہیں ٹالنا چاہئے۔ اگلی جگالی پر یہ کھلا کہ اگر جوار کی فصل سے مراد انسان کی اپنی زندگی لی جائے تو گناہ وغیرہ ہوئے فصل کو نقصان پہنچانے والے پنکھیرو اور شور مچانے کا مطلب ہوا ان گناہوں سے بچنے کی کوشش کرنا اور باوا فرید کا فرمان ہے کہ اس وقت تک کوشش کرتے رہو جب تک فصل کٹ کر گھر نہ آجائے یعنی جان جان آفرین کے حوالے نہ کر دی جائے۔

ایک اور جگالی میں عقدہ یہ کھلا کہ اس شعر کے اور مطالب بھی ہو سکتے ہیں گو کہ باوا فرید کا مطلب شاید وہی تھا جو کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ ایک مطلب مثلاً یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر کسی کام کے کرنے کا بیڑا اٹھاؤ تو اسے پورا کرنے میں جان لڑا دو اور اس کام کے رستے میں آنے والی ہر دلچسپی ہر ترغیب سے بچنے کی کوشش کرتے رہو یعنی اگر پیادہ پا صحرا عبور کرنے کی ٹھانی ہے تو۔ لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول۔

شاعروں کے یہی تو مزے ہیں کہ اپنی رو میں ایک بات کہہ جاتے ہیں اور لوگ باگ ان سے اپنی استعداد کے مطابق معانی اخذ کرتے رہتے ہیں۔ بہر حال یہ شعر اور اس پر غور و فکر مجھے سوچنا اور محنت کرنا سکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ جزا دے حضرت بابا صاحب کو بھی جنہوں نے یہ شعر کہا اور تایا یوسف کو بھی جنہوں نے مجھے یہ شعر سنایا۔

۞

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی موجودہ حالت

صفی اللہ چوہدری

مجھے گذشتہ سال پاکستان جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے ہمراہ میرے کزن مکرم قاضی مبارک احمد صاحب آف کینیڈا بھی تھے۔ جو کہ سکول اور کالج میں میرے ہم جماعت بھی رہے ہیں۔ جانے سے پہلے سفیر الحق رامہ صاحب نے اسطرف توجہ دلائی تھی کہ ہمارے کالج کی نئی عمارت زیرِ تعمیر ہے۔ المنار کے لیے نئی اور پُرانی دونوں عمارتوں کی تصاویر لینے کے علاوہ یہ پتہ کرنا بھی ضروری ہے کہ جس عمارت کی یادیں ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہزاروں طلباے قدیم کے دلوں میں بستی ہیں اُسکا مستقبل کیا ہوگا؟ ربوہ میں قیام کے دوران ہم نے ان سوالوں کا جواب حاصل کرنے اور کالج کی یادوں کو تازہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اور ایک شام بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہو گا کہ بعد از دوپہر کالج گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ کالج میں داخل ہوتے ہی ایک ناگہاں اداسی کا احساس ہوا۔ ہم نے کارپارک کی جو کہ کالج کی پرانی اور نئی زیر تعمیر عمارات کے درمیان تھی۔ قدیم کالج کی عمارت دیکھی تو وہ رونق جس کی ہم توقع کر رہے تھے وہ تو سرے سے تھی ہی نہیں۔ بلکہ عمارت کی بوسیدگی اور زبوں حالی زبان حال سے ہمیں شکایت کر رہی تھی کہ وہ سب لوگ کہاں ہیں جو یہاں سے تربیت پا کر اب دنیا میں ہر جگہ آرام و آسائش کی زندگی گزار رہے ہیں اور مجھے یکسر بھلا دیا ہے۔ گلہ کر رہی تھی کہ میری وجہ سے ہی تم نے ترقی کی منازل طے کیں اور سرخرو اور سربلند ہوئے ہو اور مجھے ہی فراموش کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عمارت یکسر تباہ حال تھی۔ فرش اکھڑے ہوئے۔ پلستر گرتے ہوئے اور اکثر حصوں کو مکمل طور پر ناقابل استعمال ہونے کی وجہ سے بند کر دیا گیا ہے۔ کالج ہال تو بالکل گرنے ہی والا بتا رہے تھے۔

ہم نے یہاں پر کچھ تصاویر بھی لیں جو کہ اس شمارہ میں شامل ہیں۔ لیکچر روم، کمروں کی حالت اتنی خراب ہے کہ اب کلاسیں بھی باہر کھلے میدان میں ہی ہوتی ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ طلبا گھاس والے سبزہ زار میں جو کہ مین بلڈنگ اور کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کے درمیان میں ہے بیٹھے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

یقین مانیے یہ مناظر دیکھ کر ہم دونوں کی حالت قابلِ دید تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے نم تھیں۔ ہم جونہی کالج میں داخل ہوئے اور تصویر کشی شروع کی سامنے سے چند پروفیسر صاحبان اور پرنسپل صاحب نظر آئے۔ ہمارے پروفیسر جہانگیر احمد چوہدری صاحب بھی مل گئے اور اُن سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ہمارا تعارف کروایا۔ ایک تصویر ان کے ساتھ بھی شامل ہے۔ انہوں نے بتایا کہ نئی عمارت زیر تعمیر ہے اور سال ۲۰۱۴ کے اواخر میں مکمل ہو کر تمام کلاسز اس میں شفٹ ہو جائیں گی۔ یہ ایک دومنزلہ عمارت ہے اور ظاہر ہے زیر تعمیر ہے اندر تو جانا ممکن نہ تھا۔ لیکن باہر سے کافی خوبصورت ہے۔

قاضی مبارک احمد، صفی اللہ، پروفیسر جہانگیر احمد چوہدری (پرنسپل کالج)

ہوسٹل کی عمارت۔ ٹک شاپ اور پرنسپل صاحب کی کوٹھی وغیرہ سب ہی ناقابلِ رہایش اور استعمال ہیں۔ یہ سب آپ تصاویر میں دیکھ سکتے ہیں۔

فوٹوگرافی کے سلسلے میں جناب قاضی صاحب کا بے حد مشکور ہوں جن کے تعاون سے یہ سب ممکن ہو سکا۔ اللہ کریم ان کو جزائے خیر سے نوازے۔ اس عبارت کی تیاری کے لئے جناب سفیر رامہ صاحب کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جنھوں نے بار بار یاد دہانی کروائی اور اپنے سوالات اور دلچسپی سے اسے قابلِ اشاعت بنایا ہے۔

منزل پر پہنچے گا اور اپنا نصب العین حاصل کریگا (وہ عظیم نصب العین)
جس کی خاطر لاکھوں مسلمانوں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا ہے
اور اپنی جانیں تک قربان کر دی ہیں" (۱۲ اپریل سنہ ۱۹۳۸)
یونیفارم

سٹاف روم
جس کی خاطر لاکھوں مسلمانوں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا ہے
اور اپنی جانیں تک قربان کر دی ہیں"
یونیفارم

خصوصی گرانٹ
خادم اعلیٰ پنجاب میاں محمّد شہباز شریف
نام منصوبہ: دوبارہ تعمیر گورنمنٹ ڈگری کالج تعلیم الاسلام فار بوائز چناب نگر
خصوصی کاوش عزت مآب مہر مسعود احمد لالی صاحب
80
خصوصی تعاون: جناب سیّد طاہر حسین صاحب کمشنر فیصل آباد
خصوصی کاوش: جناب چوہدری جہانگیر احمد پرنسپل کالج ہذا
تخمینہ لاگت: 76.117 ملین، تاریخ آغاز 18 مارچ 2011 مدت تکمیل 18 ماہ
تعمیراتی فرم: میسرز صدّیق اینڈ سنز، میسرز رجوّے کنسٹرکشن کمپنی
زیر نگرانی: محکمہ پراونشل بلڈنگ ڈویژن فیصل آباد

مہدی علی قمر شہید

داغِ فُرقت دامنِ دل سے ابھی دھویا نہیں
حادثہ کیسا تھا جس پہ دل کبھی رویا نہیں

ٹکڑے ٹکڑے دل ہوا ہے ضبطِ موجِ درد سے
صبر کی یہ انتہا ہے اب تلک رویا نہیں

خواب تیری یاد تھی اور نیند تیری جستجو
خواب میں اور نیند میں مَیں رات بھر سویا نہیں

گو ہے منزل وصل کی پر راستے ہیں ہجر کے
کیسے پہنچے گا وہ دل جو عشق کا جویا نہیں

ہر رگِ جاں میں ہے شامل ذرّہء خوں کی طرح
جستجو کیونکر کروں میں نے اسے کھویا نہیں

کچھ تو کوشش چاہیے بہرِ حصولِ التفات
فصل کاٹے گا کیا جب بیج تک بویا نہیں

داستانِ غم سنا دے ہاں دلِ محزون اب
بر زبانِ اشک، کیا ہے لب اگر گویا نہیں

(۱۰ مئی ۲۰۱۴ء)

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں اُتارا ہوتا
تو اگر میرے مقدر کا ستارا ہوتا

ٹھہر جاتا جو میری آنکھ میں پل بھر کے لیے
ہاں قسم سے تجھے دل میں بھی اُتارا ہوتا

میری قسمت کی یہ خوبی ہے تیرا لمس نصیب
ورنہ یادوں پہ کہاں اپنا گذارا ہوتا

دل میں احساس ندامت کا نہ ہوتا کوئی
عارضِ گُل کو لہو سے جو نکھارا ہوتا

تو ہی ہوتا میرے میخانہء دل کا ساقی
تیری آنکھوں کا ہر اک جام ہمارا ہوتا

غم دوراں کیلیے کاش نہ فُرصت ملتی
غم جاناں پہ کیا خوب گذارہ ہوتا

خنداں ہو جاتی نِگارِ شبِ مہتاب اگر
تو نے زُلفوں کو جو ہلکا سا سنوارا ہوتا

آبلہ پا میں نہ پھرتا یونہی صحرا میں کبھی
وحشتِ دل کا اگر کوئی کنارا ہوتا

میرے آنگن میں اتر آتا کبھی شام کے بعد
تو وہ سورج تو وہی نور کا دھارا ہوتا

(۱۷ مئی ۲۰۱۴ء)

مہدی علی کے نام

(عبد السلام جمیل)

یقین جان ایک بار
نہیں ہوا مجھے گماں
جو تیری جان چلی گئی
بے سود چلی گئی
جو تیرا خون بہہ گیا
بہہ گیا ہے رائیگاں
مہدی تجھے پتہ تو ہے
مقام جو شہید کا
موازنہ نہیں کوئی
حسین کا، یزید کا
شہید کی موت تو
دائمی حیات ہے
شہید کے وجود سے
قوم کو ثبات ہے

تو آخرین کی صف میں تھا
سابقون سے مل گیا
غنچہ تھا صفات کا
گلاب بن کے کھل گیا

تجھے لگی جو گولیاں
بہشت کی تھی چابیاں
دیکھ وہ در کھُل گیا
جس سے جو گزر گیا
خدا کا قُرب پا گیا
ہو گیا وہ جاوداں
تا بہ ابد ضوفشاں

دیکھ اپنا اعزاز تو
امامِ وقت کی زباں
پیار سے رُندھی ہوئی
تیرے ذکر سے ہے تر
گِن وا رہی ہے نیکیاں
پڑھ رہی تیرے شعر
دہرا رہی ہے خوبیاں

یہ بھی نہیں تیرا فراق
سینے کا دُکھ نہیں بنا
تیرے ہر ایک گھاؤ پہ
دل سے میرے لہو بہا

دیکھ تیری لحد پہ
اک ہجوم قدسیاں
پلکوں پہ ہے لیے ہوئے
پیار کی لو کے دیے
آیا ہے کہنے الوداع
صبر سے اپنے لب سیے

یہ تیرا نصیب ہے
ہوا سرفراز تو
قوم کو دے گیا
ایک اور اعزاز تو
اب باغ بہشت میں
ہمارے لیے دعا تو کر
ہم پہ آئے وقت گر
ہم بھی اسی راہ پر
وار دیں یہ زندگی
ہم بھی ہوں جاوداں
تا بہ ابد ضوفشاں

An Unforgettable Experience of SURVIVAL AT SEA

By Brig (Rtd.) Mirza Irshad Ali

A true story of faith hope and courage, An Ahmadi Muslim Naval officer Pakistan Navy lives to share his life's most significant event today…. Read on...

After passing the matriculation examination from Talim ul Islam High School Rabwah in 1957, I got admission in Talim ul Islam College Rabwah and did the F.Sc. (Medical) in 1959. I got admission in Liaquat Medical College in 1960 and passed MBBS examination in 1965. I immediately joined the Pakistani Army in the Army Medical Corps and served at different stations for 28 years. My last appointment was as Assistant Commandant Armed Forces Medical College in the rank of Brigadier from where I retired in November 1993 after serving for over 2 years. During those 28 years, I was twice seconded to the Pakistan Navy and this "unforgettable experience" was during my first tenure with the Navy.

During the December 1971 war between India and Pakistan I was serving as Senior Medical Officer on the Pakistan Navy ship Khaibar. PNS Khaibar was a Battle Class Destroyer and was on patrolling duties 65-70 miles off shore in the Arabian Sea.

It was the second day of the war and at night I was in my cabin located somewhere in the posterior one third of the ship. Besides my cabin there was the sick bay, a place serving as an ER, OPD, some patients' detention beds, and medical stores. In addition to the medical set up there were some more stores of the ship and living accommodation, etc., in that area.

It was about 8:30 PM that night. After saying my Isha prayer I thought it was too early to go to bed. In those days Radio Pakistan used to broadcast short news bulletins every

hour. So I decided to go up to the bridge to listen to the 10pm news and then go to sleep. Although I had a small transistor radio with me, it would not work in a closed steel compartment. So I walked about 20-25 yards towards the front on the iron deck (similar to a ground floor) and climbed up one stair to take another flight of stairs to the bridge. There I met Lieutenant Commander Mumtaz Anwar, father of Dr. Mohammad Ali Mumtaz and Dr. Mubashar Ahmad. Lt Cdr Anwar was the engineer officer of the ship. We had a small talk and I just told him that I was going up to the bridge to listen to the news before going to bed. At that time, suddenly, action station was sounded on the ship. The action station is sounded when there is an emergency and everybody is supposed to rush to his pre-assigned place of duty. By chance, I was just a couple of steps away from my action station - the ward room. Before I stepped towards my action station, our anti air craft guns started firing and after 5-6 rounds of fire there was a huge blast on the ship which shook us and the ship stopped moving. At that time, Lt Cdr Anwar received a telephone call and after attending that he told me that there was fire in the engine room and he was going there. He took the stairs leading to the engine room area and I entered my action station which was the ward room. In that room there was a medical cupboard having necessary equipment and medicines for first aid. After a few seconds, our anti aircraft guns started firing again and after a few rounds, there was another huge blast which sounded louder and closer than the one before. It was followed by a panicky noise on the ship, the power went off and I felt the ship was listing towards the right side. As there was complete darkness in that room, I decided to go out. I could see light of fire outside from the crevices and noise from people. There were two doors in the ward room. I tried the one on the backside, but I could not open it as some very heavy object had fallen behind that and the door would not budge. Then, in the dark, I tried to open the one on the right side of the ward room, but the locking clips wouldn't move as the door had caved in as a result of the blast. Here I thought I was trapped inside as many times I tried to rotate the heavy metal clips to open the door, without success. Then I tried to rotate one clip at the lower part of the door towards the closing direction which moved and also created some space for the other clips to move towards the right direction and finally I could open the door and came out. At that time I saw that the rear end of the ship was submerging in the sea and the front of the ship was going up. After coming out of the ward room, I saw fire all around the ship in the sea due to the burning furnace fuel oil, which is lighter than water and is very thick like tar. It appeared that the fuel tanks of our ship had been ripped open by those explosions. There in the open I met one of my nursing assistants who was supposed to be in that part of the ship. He had minor injuries and one leg of his pant was blown off as a result of the blast. He told me that orders to abandon the ship had been announced. He also told me that the first hit was where our sick bay, etc., was located and nobody from that area had survived. That part of the ship was completely destroyed – the place which I had left a few minutes before. I told him to jump in the water and I would try to do something for him there.

Now from the right side of the ship I walked towards the left side and took the stairs to reach the deck from where I wanted to leave the ship. As soon as I reached the deck, there was another huge blast on the right side again near the place I had just left. That blast threw me in the air for about 6 feet and I hit the perimeter fence of the ship lying senseless on the deck. When that part of the ship submerged in the water, its splashes awakened me up and I just walked into the sea. Luckily I was saved from shrapnels because of the huge intervening structures of the ship such as the chimneys, diesel generator, etc.

In the sea, there was another problem as there was fire all around the ship because of the burning fuel oil spilled out of the ships' tanks and it was difficult to swim away from the ship through that fire. Luckily, I found a small wooden plank by means of which I moved the burning oil away to create a passage for me. I wanted to move away from the ship as quickly as possible as I knew that when a huge object sinks in the sea it sucks everything nearby with it to the bottom of the sea and secondly there was a possibility that the ammunition in the ship may catch fire and explode resulting in damage all around. I had seen some people about 200 yards away clustered around something. I swam towards them and found that there were two damaged life rafts. These were small rubber tubes with a floor of a rubber sheet. The tube was subdivided into independent compartments so that if part of it was damaged, the undamaged parts would keep it afloat. In addition, there was supposed to be a

survival pack containing some emergency rations, cans of water, first aid equipment, search lights, flares, etc. These survival packs were not there possibly having been blown away and the rafts were also damaged. Under normal conditions, one raft was good enough to provide support to 16 people. At that time, we were about 80. When I was about 200 yards away from the ship, the rear of the ship completely sank lifting the front skywards and in that position it went into the sea forever. It took a total of about 25 minutes from the first blast to completely sinking of the ship in the sea.

It was decided initially to house the injured ones in the rafts and the rest should hang around holding on to the slings around the rafts, but this was not followed strictly right from the start and ignored completely later on. Although I had a life jacket with me, it was damaged and could not be inflated so I had to hang around the rafts holding the slings throughout to keep myself afloat.

After the first blast, the ships staff did manage to pass on the information to the rear headquarters that there had been a blast on the ship as a result of the enemy attack and ship was nonoperational. This message was passed through a wireless system, but after the second hit, the wireless system and everything else was completely destroyed. As a result, we lost contact completely. The approximate time of sinking of the ship was 10:30 PM. We kept on floating the whole night with the hope for being rescued and kept on losing those who were injured and could not struggle anymore.

Now briefly about what happened during that time. This is the information I got from my colleagues who discussed the things among themselves. Our ship was hit by three missiles called STYX missiles. They had 500kg (1100lbs) of explosive charge each and were fired from the OSSA boat. These boats were of very low profile hence not easy to be detected. They were brought near the target by a mother ship. These missiles were of Russian origin and were homing, meaning they followed the target even if it moved. These were fired from a distance of about 10-12 miles and were exactly on target. The first missile hit was in the rear one third of the ship where my cabin and sick bay was located. The second and third hits were somewhere in the middle of the ship. All of those were on the right side and destroyed the equipment and other operational elements. The second missile more or less was on the engine room area where Lt Cdr Anwar had gone a few seconds before.

As the sun rose in the morning it also brought some rise in the level of hope for some help. Just before noon, we saw a civilian merchant ship far away and tried all sorts of measures to get attention of somebody on that ship without any success. Gradually it kept on sailing on its way till it finally disappeared.

Here I would like to mention a few notable observations which I had during that period. But before that I want to mention about another Ahmadi officer – Lieutenant Fazal Ahmad. He was the electrical officer of the ship and was last seen on the deck standing in the open somewhere in the middle of the ship when the second missile hit took place. He was not traceable after that. Coming back to the observations - those who remained composed and did not panic fared better than those who did not. I remember one sailor who was quiet the whole night, but started making noises and became agitated. He had to be repeatedly controlled verbally and sometimes physically . He would calm down for a short time to land in the same condition again. Around noon he was not heard for some time and after a couple of hours we saw his body floating nearby. Otherwise he had not physical injury.

There was another sailor who himself came to me saying that he wanted to give up having no hope for survival. I assured him and told him to have some faith in God. He was OK for some time, but again wanted to give up and was reassured again. After 3-4 attempts, he gave his life jacket to another person who did not have one and went into the depth of the sea -visible for some depth, a few air bubbles came out from his mouth and nose and finally he disappeared in the depth of the sea forever!

A sailor spotted a can floating at a distance from the group. He brought that to the group. It was a can of water. We tried to open it with our teeth and took turns for that till we succeeded – sharing a sip of water one by one till it was empty. I also had some sleep while immersed in water from neck down to feet holding on to one of the slings around the raft.

In the late afternoon, we spotted a civilian aircraft hovering in that area and after some time it went away. After about 1.5 hours we saw a small motor boat sailing towards us. It turned out to be PNS Sudaquat, a small gun boat of our Navy sent to pick us up. It had a ladder on its side and we climbed up one by one. I re-

member I had to lie down on the bare deck of the boat for some time as I was extremely exhausted due to floating in the sea for more than 20 hours. Everyone else was also in the same state. We started sailing towards Karachi harbor and it took about two hours. We were asked to wait some distance away from the harbor as that area was in a state of an air attack warning at that time. After waiting for about 45 minutes or so we touched the jetty to disembark and put our foot on the ground. It was well after 11pm and there were some arrangements for our reception such as an emergency medical team, ambulance, etc., but no one among us was in a state to utilize those. After some time we were offered transport to go home. In all we were 49 in number who reached ashore at that time out of a total of more than 270. Later on some survivors came ashore on their own also using some other means to float and made it to land. They were 3 in number. My wife had shifted to her parents home who lived nearby and I reached there at almost 1am to join her and our 10 month old son, now Dr. Iftikhar Ahmad Ali.

In regards to my physical condition, I had severe pain and a constant ringing sound in both ears. Our ENT specialist told me that I had a rupture of both of my ear drums and that they would heal with the passage of time. They healed in 2 -3 weeks and the ringing noise also disappeared, but the hearing power is still not normal even uptil now. I lost about 16lbs in those 20 hours. About a week before going to sea our annual medical checkup was done. At that time, my weight was 168lbs and on return it was 152lbs. Also as a result of being in salty sea water for almost 20hours, the superficial layer of my skin started peeling off in the form of fine scales from my whole body leaving no residual mark.

Sometimes I am asked whether there was any scary situation during that period. The answer is yes, but that was only once. That was when I considered myself locked up in the ward room and I could not open the doors to come out knowing fully well that the ship was sinking in the sea.

It is my firm belief that God Almighty kept me under His protection at every step. Some of those I know and there must be many more about which I am not aware of. Fa. Alhamdolillah Ala Zalik.
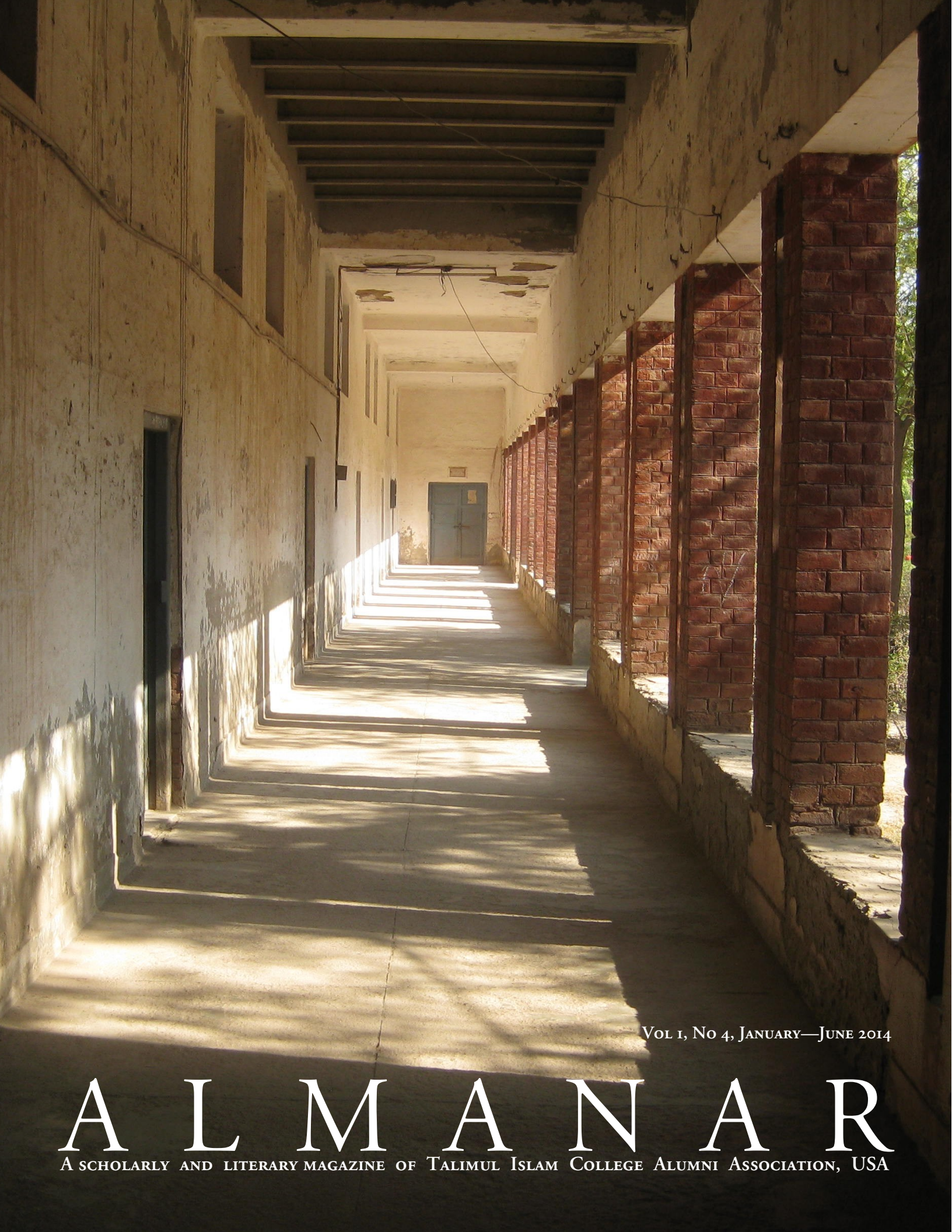
Vol 1, No 4, January—June 2014
ALMANAR
A scholarly and literary magazine of Talimul Islam College Alumni Association, USA